اردو کے چند خاکہ نگار

قدرت اللہ شہزاد

DISCLAIMER

All the books we provide on Kitaabiyat, are the digitalized versions of the Hardcopies we OWN. We **don't** promote piracy. If you like the books then **support their authors** by buying the originals.

Posting of our books in any forum/board/blog/website is STRICTLY PROHIBITED.

Uploading of our books to any other media uploading service / community reading services (i.e SCRIBD), without our permission is prohibited.

The hardwork we do, in presenting the books to you, takes quite lot of effort. With every page Photoshopped, and every line checked for its readability, should be respected

Some people are **stealing** our work, we need your help, if you see our books anywhere other than Kitaabiyat, please let us know. We'll consider it your support for the promotion of **Urdu Literature**.

Support us by keep visiting and also by telling others about Kitaabiyat.

Prof. Akbar

Prof. Muhammad Akbar Qureshi

kitaabiyat.blogspot.com

SUPPORT US!
TO HELP US IMPROVE KITAABIYAT

“Ads by Google Urdu Novels Funny SMS KI 67 Send SMS Urdu Poems
JAN 21, 2010”

YEAH ONLY YOU CAN DO IT...

TELL OTHERS ABOUT US & KEEP VISITING FOR DOWNLOADING THE BEST URDU LITERATURE , ON THE NET.

kitaabiyat.blogspot.com

تمام مخلصین کے نام

kitaabiyat.blogspot.com

ترتیب

☆	اپنی بات	
۱۔	عبدالمجید سالک	۹
۲۔	مالک رام	۱۴
۳۔	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۱
۴۔	احمد ندیم قاسمی	۳۸
۵۔	ڈاکٹر وزیر آغا	۴۵
۶۔	حمیدہ اختر رائے پوری	۴۹
۷۔	ڈاکٹر اسلم فرخی	۵۹
۸۔	ڈاکٹر ابوالخیر کشفی	۸۰
۹۔	ڈاکٹر آفتاب احمد	۸۷
۱۰۔	اے حمید	۹۳
۱۱۔	ابوالفضل صدیقی	۱۰۴
۱۲۔	عطاء الحق قاسمی	۱۱۳
۱۳۔	یونس جاوید	۱۲۲
۱۴۔	محمود علی	۱۲۸

☆☆☆☆

kitaabiyat.blogspot.com

اپنی بات

خاکہ نگاری ایسی صنفِ ادب ہے جسے اہلِ قلم نے بالعموم جزوی طور پر اپنایا شاید ان کی عدم توجہی کے سبب اس کا تنقیدی سرمایہ بھی بہت محدود ہے۔ انفرادی طور پر اکا دُکا مضامین لکھے گئے جو رسائل کے اوراق میں گم ہو گئے۔ محمد طفیل کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا نظر نہیں آتا کہ جس کی شناخت صرف اسی صنف سے ہو بالکل اسی طرح ڈاکٹر بشیر سیفی کے علاوہ کسی اور تنقید نگار نے خاکہ نگاری پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ زیادہ سے زیادہ یحییٰ امجد کو شامل کر لیجیے۔ خاکہ نگاری کا سفر سست روی سے جاری ہے لیکن اس کی تنقید کا سفر اس سے بھی زیادہ دھیمی رفتار سے ہے۔

سوانحی ادب بالخصوص خاکہ نگاری سے خصوصی دلچسپی نے تحریک پیدا کی کہ اس صنف پر کچھ لکھا جائے۔ سو چار پانچ سال قبل مختلف خاکہ نگاروں کے فن کا الگ الگ جائزہ لینے کا آغاز کر دیا۔ یہ مضامین سہ ماہی ''الزبیر'' میں شائع ہوتے رہے۔ اب جب ان کی تعداد مناسب ہو گئی تو مجموعے کی صورت دینے کا خیال پیدا ہوا۔

یہ مضامین کسی خاص منصوبے کے تحت نہیں لکھے گئے اس لیے اس اعتراض پر معذرت خواہ ہوں گا کہ فلاں کے بارے میں نہیں لکھا گیا یا فلاں اتنا اہم خاکہ نگار ہے اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میں نے اپنی طرف سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا۔ سب پر لکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی البتہ ترجیح میں وہ لوگ شامل ہیں جن کی خاکہ نگاری پر کام ہونا باقی ہے۔ بہر حال خاکہ نویسی پر حقیر سی کاوش پیشِ خدمت ہے ــــ قبول فرمائیے۔

آخر میں محترم پروفیسر ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی، برادرم سید از ہر عزیز اور برادرم محمد صدیق کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کتاب کی اشاعت کے سفر میں میری معاونت فرمائی۔

قدرت اللہ شہزاد
شعبہ اردو
صادق پبلک سکول بہاول پور
جون 2007ء
فون: 062-2876758
062-2053915

kitaabiyat.blogspot.com

عبدالمجید سالک

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اردو کے پہلے خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں جنہوں نے ڈپٹی نذیر احمد کا لازوال خاکہ لکھ کر شہرتِ دوام پائی۔ لیکن ڈاکٹر ابوالخیر کشفی پہلے خاکہ نگار کے طور پر سجاد حیدر یلدرم کا کھوج لگاتے ہیں جنہوں نے فرحت اللہ بیگ سے کہیں پہلے دسمبر ۱۹۰۸ء میں حسرت موہانی کا خاکہ ''خافی خاں'' کے نام سے لکھا جو ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوا۔ ہوسکتا ہے کل کوئی اور محقق سراغ لگاتے لگاتے کسی اور ادیب تک جا پہنچے اور ابوالخیر کشفی کی تحقیق پیچھے رہ جائے۔

خاکہ نویسی کے ضمن میں ہم بہت سے ناموں کو نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ ان کی وجہ شناخت کچھ اور ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں اپنے عہد کا ایک نہایت معتبر نام عبدالمجید سالک کا ہے جنہوں نے یلدرم کے ٹھیک ۴۷ سال بعد دسمبر ۱۹۵۵ء میں ''یارانِ کہن'' کے نام سے بیس نامور شخصیات کے خاکے لکھ کر اس فن کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ سالک کی یہ تصنیف آغا شورش کاشمیری کے ادارہ ''مطبوعات چٹان'' نے شائع کی۔

''یارانِ کہن'' میں علامہ اقبال اور مولانا غلام قادر گرامی کے خاکوں کو شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا گرامی کا خاکہ دلچسپی کی انتہائی حدوں کو چھوتا ہوا ہے۔ ان کی ذات پر شاید ہی اس سے زیادہ اچھا خاکہ لکھا گیا ہو۔ وہ پورے سراپے کے ساتھ ہمارے سامنے آ موجود ہوتے ہیں۔ ان کی پوری شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس خاکے میں گرامی کی غیر حاضر دماغی اور حواس باختگی کے پہلو زیادہ ابھرے ہیں لیکن ایسا دانستہ طور پر نہیں کیا گیا بلکہ مولانا کی شخصیت کے یہی گہرے رنگ ہیں جنہیں یقینی طور پر **flash** ہونا تھا۔ سالک کا انداز بیان منفی تاثر پیدا کرنے کی بجائے معصومیت کا نقش ابھارتا ہے۔

kitaabiyat.blogspot.com

علامہ اقبال کا خاکہ بھی قاری کے قلب و ذہن کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ ذکرِ اقبال پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن خاکے کے روپ میں شاید ہی اس سے اچھا ذکر کہیں اور ہو۔ ان کی بشری خامیوں کو بھی احتیاط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ نہ تو ادب و احترام پر حرف آئے اور نہ ہی تاریخ مسخ ہو۔

''مولانا محمد علی'' خاکہ نما مضمون ہے اس میں سالک کے مشاہدات کم ہیں معلومات سے استفادہ زیادہ ہے تاہم دلچسپی کا پہلو نمایاں ہے۔ اسی طرح ''مولانا شوکت علی'' میں ذاتی مشاہدہ کم ہے عصری معلومات سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ یہ مضمون اتنی مشاقی اور مہارت سے لکھا گیا ہے کہ مصنف کی اس کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ اچھے سے اچھا خاکہ شناس بھی اسے جاندار خاکہ قرار دینے میں قطعی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔

شمس العلماء مولوی سیّد ممتاز علی کے ''خاکہ'' میں شخصیت سے زیادہ علمی مرتبے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ قاری مولانا کی ذات سے بھرپور آگہی حاصل نہیں کر پاتا۔

عبدالمجید سالک کی مولانا ظفر علی خاں سے بہت قربت رہی پھر اختلافات بھی ہوئے۔ اتنی قربت کے سبب شہکار قسم کے خاکے کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن سالک کی احتیاط نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اگر سالک اس خاکے میں محتاط نہ ہوتے تو اختلافات کے پس منظر میں عصبیت کا الزام بھی لگ سکتا تھا۔ سالک نے تحریر کو متوازن رکھنے کے لیے شعوری طور پر متنازعہ امور کو سامنے نہ آنے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاکے میں صرف سیاسی و صحافتی پہلو واضح ہوئے۔ مولانا کی جذباتیت اور تصور پرستی یعنی خیالی پلاؤ پکانے کی بشری خامیاں سامنے تو آئیں لیکن اس انداز میں نہیں کہ ذم کا پہلو نکلے۔ سالک کے اس انداز نے ان کی تحریر کو تاریخی اعتبار بخشا ہے۔

''میاں فضل حسین'' بھی سالک کا بھرپور اور جاندار خاکہ ہے جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ تاہم انہوں نے میاں صاحب کی لغزشوں، خطاؤں اور کمزوریوں سے پہلو تہی کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سالک کی نظروں سے اوجھل رہی ہوں۔ اسی طرح ''سردار سکندر حیات خاں'' میں سردار صاحب کے محاسن کو تو سامنے لایا گیا ہے لیکن معائب سے پردہ پوشی کی گئی ہے۔ اس خاکے میں سردار صاحب کی سیاسی زندگی پر وکیلانہ استدلال اختیار کیا گیا ہے۔ ان کی ذاتی زندگی کے حوالے سے مواد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس عمل نے خاکے کو مضمون کے قریب تر کر دیا ہے۔

چودھری شہاب الدین کی شخصیت پر لکھا گیا خاکہ علامہ اقبال کی پھبتیوں سے خاصا چٹپٹا بن گیا ہے۔ اس خاکے میں جیتے جاگتے چودھری شہاب الدین ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔

''آغا حشر'' سالک کا دلچسپ خاکہ ہے۔ آخر میں یوں لگتا ہے کہ روانیٔ قلم کو دانستہ طور پر روک دیا گیا ہے اسی سبب تشنگی کا احساس ابھرتا ہے۔ اسی طرح ''مولانا احمد سعید'' کے باب میں بھی ادھورے پن کا احساس پایا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ طوالت کے خوف کے پیش نظر اختتام کیا گیا ہے، لیکن اس عمل سے خاکے کا حسن گہنا گیا ہے۔

''مولانا حسرت موہانی'' ایک عمدہ خاکہ ہے جسے خاکہ نگاری کی تاریخ کسی طور نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ''مولانا ابوالکلام آزاد'' بھی اچھا خاکہ ہے جس میں شخصیت کے صحیح خدوخال ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر تاثیر کے خاکے بھی فنی لحاظ سے عمدگی کی خصوصیت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ حکیم فقیر محمد چشتی کا خاکہ خامیوں کا ذکر نہ ہونے کے باوجود قاری کو گرفت میں لینے کی خصوصیت رکھتا ہے۔ ''چراغ حسن حسرت'' میں عیب و ہنر دونوں میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ حد درجہ اعتدال پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ خاصا کامیاب خاکہ ہے۔ ''حامد حسین بیدل شاہجہانپوری'' کا خاکہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ شاید ہی کسی مضمون میں بیدل کے حوالے سے اتنی معلومات فراہم ہوں۔

عبدالمجید سالک کے مولانا تاجور نجیب آبادی سے گہرے مراسم تھے۔ جس کے سبب وہ مولانا تاجور کا نہایت عمدہ خاکہ لکھ سکتے تھے لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ خاکے میں تاجور کی شخصیت کے خدوخال اچھی طرح ابھر کر سامنے نہیں آسکے۔ ایسا خاکہ تو عام جاننے والا قلمکار بھی لکھ سکتا تھا جبکہ یہ تو تاجور کے دیرینہ دوست کا لکھا ہوا ہے اور لکھنے والا

kitaabiyat.blogspot.com

اپنے عہد کا بڑا ادیب ہے جو زبان کی نزاکتوں سے بھرپور واقفیت رکھتا ہے۔اس کے باوجود اتنا پھسپھسا مضمون اچنبھے کی بات ہے۔ شاید یہاں سالک کی عجلت آڑے آئی ہے جس کا اعتراف انہوں نے کتاب کے دیباچے ''گذارش'' میں یوں کیا ہے:

''یہ کتاب آغا شورش کے 'تو اتی ڈالنے' کی وجہ سے صرف چند
روز میں لکھی گئی ہے۔''

عبدالمجید سالک نے ''یارانِ کہن'' میں اپنے عہد کی نہایت قدآور شخصیات کے خاکے لکھے ہیں جن کا ان سے قرب تعلق رہا ہے لیکن ایک خاکہ ایسا بھی ہے کہ جس کی شخصیت نہ تو اہم اور نہ ہی سالک کی گہری وابستگی کی مظہر ہے۔ یہ خاکہ سیّد حبیب مدیر ''سیاست'' کا ہے۔ ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ایسی تصنیف جس میں چوٹی کی شخصیات کے خاکے جمع ہیں اس میں اتنی پست قامت شخصیت پر مضمون کیوں شامل ہے۔ جس کا بیشتر حصہ منفی اور ذاتی عصبیت کا آئینہ دار ہے۔ اگرچہ آخر میں ''سیّد صاحب کی خوبیاں'' کے عنوان کے تحت تیرہ سطور لکھ کر توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود شخصیت کا منفی تاثر برقرار رہتا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ نثر پارہ اگرچہ خاکہ ہی ہے لیکن اتنی عمدہ تصنیف میں یہ بے ڈھب پیوندکاری کے مترادف ہے۔ بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جن کا سالک صاحب سے سیّد حبیب جیسا تعلق رہا ہو گا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ پھر ایسی گمنام شخصیت پر منفی اثرات مرتب کرنے والا خاکہ لکھنا کیوں ضروری سمجھا گیا۔ اگرچہ اس خاکے میں غم و غصے کا اظہار نہیں، پوری ہوشمندی کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن اس میں چھپی سالک صاحب کی بشری کمزوری صاف ظاہر ہوتی ہے۔

حلیہ نگاری خاکے کا لازمہ ہے۔ سالک اس ضمن میں تفصیل نہیں، اجمال کے قائل ہیں۔ وہ اپنے ممدوح کا حلیہ چند الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ سچ مچ ہمارے سامنے کھڑی محسوس ہوتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی کے حوالے سے دیکھئے:

''سر پر ترکی ٹوپی جس کے کناروں پر ایک انچ چکٹ جما ہوا، گندمی
رنگ، چہرے پر چیچک کے داغ، بھری ہوئی بے ترتیب ڈاڑھی،

زدہ کی شیروانی، میلا پاجامہ، جوتی نے کبھی پالش کی شکل بھی نہ
دیکھی، آواز کچھ باریک کچھ بھرائی ہوئی، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے
میں سادگی اور غربت کے مجسم نمونے۔'' (ص:۱۳۱)

عبدالمجید سالک کے خاکے واقعات نگاری کے عمدہ مرقعے ہیں۔ انہوں نے شخصیت کا نقش واقعات کے ذریعہ بٹھانے کی کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ کہیں بھی غیر سنجیدگی، نامعقولیت اور سطحیت کا مظاہرہ نہیں کیا جس کے سبب ان کے خاکے تاریخی دستاویز کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ کا شعور رکھنے والے یقیناً ان واقعات کو معتبر جانیں گے۔

سالک کی زبان و بیان پر قدرت سے کس کو انکار ہے۔ ان کی زبان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہے۔ وہ اہلِ زبان کا محاورہ استعمال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں جھاڑ باندھنا، کلیجہ ہاتھ بھر کا ہونا، اچپلاہٹ، گلیارے، جھابڑ جھلا، چخ ہو گئی، جیسے ٹھیٹھ روزمرے و محاورے بکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں صفظلے، گسیتہ مہار ہو کر، قدوم میمنت لزوم جیسی بھاری بھرکم فارسی و عربی تراکیب بھی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو نئے الفاظ بھی عطا کیے۔ مثلاً ایک مقام پر انہوں نے احباب کے لیے 'یار جوں' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

عبدالمجید سالک کے خاکوں میں ذاتی جذبات کا عمل دخل بہت کم ہے۔ متانت کا غلبہ ہے۔ وہ ہر مقام پر حد اعتدال کو قائم رکھتے ہیں۔ نہ تو کسی کی اتنی خامیاں گنوائی جاتی ہیں کہ شخصیت پر خطاؤں کی پوٹ کا گمان ہو اور نہ ہی وہ کسی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ شخصیت ماورائی لگے۔ انہوں نے بے جا طرفداری سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اس کے باوجود بعض افراد سے ان کی غیر معمولی محبتیں اور وابستگیاں جھلکتی ہیں۔

ایک بات طے ہے کہ سالک کا کوئی خاکہ ایسا نہیں جس سے قاری بوریت، اکتاہٹ یا بوجھل پن محسوس کرے اور اچھے خاکے کی یہی شان ہے۔ اس خوبی کی بناء پر عبدالمجید سالک بلاشبہ نہایت کامیاب خاکہ نگار ہیں۔

kitaabiyat.blogspot.com

مالک رام

بعض لوگ شعوری طور پر خاکہ لکھتے ہیں جبکہ بہت سے ایسے ہیں کہ جنہوں نے یہ سوچ کر نہیں لکھا کہ وہ شخصی خاکہ لکھ رہے ہیں بلکہ اپنی یادوں کے حوالے سے اصحاب کی زندگی کے ایام کو سپرد قلم کیا۔ ایسے لوگوں میں برصغیر کے معروف ادیب مالک رام ہیں جنہوں نے اپنے شخصی مضامین کے حوالے سے خاکہ نگاری کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن ان کے مضامین خاکے کے بنیادی اصولوں پر پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''وہ صورتیں الٰہی'' میں نو طویل خاکے لکھے جو سوانحی ادب کا اثاثہ ہیں۔

مالک رام کی تصنیف کا پہلا خاکہ غالب پر ہے جس میں ندرت و جدت ہے۔ انہوں نے اسے اس حسن و خوبی سے لکھا ہے کہ غالب کے دور میں نہ ہونے کے باوجود قاری یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ خاکہ نگار غالب کے عہد کا ہی کوئی شخص ہے جس نے اپنے ممدوح کے شب و روز کا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا ہے۔ بقول ان کے:

> ''میں آپ کو کیونکر یقین دلاؤں کہ غالب سے میری اکثر ملاقات رہی ہے اور میں نے انہیں بھی اتنے ہی قریب سے دیکھا ہے جتنا ان دوسرے بزرگوں کو، جن کے حالات آپ اس کتاب میں پائیں گے۔ بلکہ جسارت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ دوسروں کی موت کے بعد ان سے ملاقات واقعی منقطع ہوگئی غالب سے تو آج تک جاری ہے، حالانکہ وہ جسدی لحاظ سے ان سب سے پہلے راہیٔ ملک بقا ہوئے تھے۔'' (ص:۱۰)

ان جملوں سے مالک رام کی غالب سے گہری عقیدت کا پتہ لگتا ہے اور غالب

شناسی میں ان کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔ داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے کس مہارت اور چابکدستی سے غالبیات سے خوشہ چینی کر کے خاکہ ترتیب دیا اور قاری کو اس میں اس قدر گم کر دیا کہ وہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ یہ سب کچھ خاکہ نگار کے ساتھ یا سامنے پیش آیا۔ اس خاکے کے مندرجات میں کوئی بات بھی حقیقت سے بعید نہیں۔ غالب کے مکالموں میں ان کی روزمرہ زبان کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ واقعی مرزا بول رہے ہیں۔ میرے خیال میں ایسی نظیر اردو خاکہ نگاری میں مالک رام سے قبل نہیں ملے گی۔

ہر خاکہ نگار اپنے اسلوب میں شخصیت کا نقشہ کھینچتا ہے۔ مالک رام سراپا نگاری میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ وہ اس انداز سے خدوخال بیان کرتے ہیں کہ پوری شخصیت آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ اس ضمن میں وہ جزئیات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا حلیہ یوں بیاں کرتے ہیں:

> ''نسبتاً چھوٹا قد، آفتابی چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کشادہ اونچی پیشانی، کسی قدر لمبی ناک جو پھنگ کے قریب قدرے موٹی ہوگئی تھی، قص الشوارب و اعفاء اللحی کا مصداق چھوٹی چھوٹی لبیں اور گھنی کھچڑی ڈاڑھی جو بہت لمبی نہیں تھی اور جس میں سفید بال زیادہ تھے اور سیاہ کم، صاف ستھرا کھلتا رنگ، گلے میں شیروانی نما بند گلے کا کوٹ جس کی دائیں طرف کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی اور دوسری طرف لکھنے کا قلم نظر آ رہا تھا، نیچے سفید پاجامہ اور سر پر عمامہ جس کا شملہ پیچھے سے اٹھا کر خاص طریقے سے اڑس رکھا تھا۔ یہ تھا ان کا حلیہ۔'' (ص:۱۰۱)

واقعات شخصیت کا باطن سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو قاری کی دلچسپی کا سامان ہوتا ہے دوسری طرف غیر محسوس انداز میں شخصیت کے اسرار کھلنے شروع ہوتے ہیں۔ وہ پہلو جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں، خاکہ نگار واقعات کے

kitaabiyat.blogspot.com

ذریعے اپنے پڑھنے والوں کو ان سے متعارف کراتا ہے۔ مالک رام بھی شخصیت کے باطن کو ظاہر کرنے کے لیے واقعات کا سہارا لیتے ہیں بلکہ ان کے خاکے مجموعی اعتبار سے واقعات نگاری کا حسین مرقع ہیں۔

مالک رام کے بیشتر خاکے طویل ہیں۔ ۲۵۶ صفحات کی کتاب میں صرف نو خاکے ہیں۔ یہ طوالت کے باوجود بے ہنگم ہرگز نہیں۔ انہوں نے اپنے قلم کو بھٹکنے نہیں دیا۔ تمام تفصیلات ممدوح کے گرد ہی گھومتی ہیں اس لیے کوئی بھی خاکہ گراں نہیں گزرتا۔

مالک رام کے زیادہ تر خاکے مختلف حصوں میں منقسم ہیں۔ ایسا عموماً اس وقت کیا جاتا ہے جب ایک ہی شخصیت پر مختلف ادوار میں لکھا گیا ہو جس کے سب آپس میں ربط نہ ہو رہا ہو بلکہ الگ الگ یونٹ ہوں۔ لیکن مالک رام کے ہاں ایسا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے طوالت کے احساس کو کم کرنے کے لیے یہ ''نسخہ'' استعمال کیا ہو۔

مالک رام کے خاکوں میں علمی ماحول کا احساس ہوتا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ممدوحین علم وادب کی دیوقامت شخصیات ہیں اور مالک رام خود علمی دنیا کی معتبر ہستی ہیں۔

خاکہ نگاری کے حوالے سے بعض ناقدین فن کا خیال ہے کہ محترم شخصیات کی بشری کمزوریوں اور فاش غلطیوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے جبکہ کچھ کہتے ہیں کہ خاکہ تب ہی مکمل ہوتا ہے کہ جب شخصیت کی تمام کجیوں کو بعینہٖ بیان کیا جائے۔ محمد طفیل سمیت کچھ اور لوگوں کی رائے یہ ہے کہ خامیاں ضرور بیان کی جائیں لیکن اس حسن وخوبی کے ساتھ کہ شخصیت بھدی نہ لگے۔ بلکہ بھدے پن کو بھی اس عمدگی سے بیان کیا جائے کہ توہین محسوس نہ ہو اور دلآزاری کا پہلو نہ نکلے۔ جب ہم مالک رام کے خاکوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ وہ شخصیت کے احترام کو ہر صورت پیش نظر رکھتے ہیں۔ اختلافی رائے میں بھی ادب کا دامن چھوٹنے نہیں دیتے۔ عیب جوئی سے گریز کرتے ہیں کیونکہ اسے شخصیت نگاری کے اصولوں کے منافی سمجھتے ہیں۔ وہ عقیدت واحترام کے باوجود غلو، رنگ آمیزی اور انتہا پسندی سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ ہر مرحلے پر حقیقت نگاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک دو

خاکوں میں ممدوح کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے لیکن عمدگی کے ساتھ۔ یاس یگانہ چنگیزی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> ''وہ مذہب کے معاملے میں کچھ آزاد خیال تھے۔ غالباً جس زمانے میں بغداد میں تھا انہوں نے ایک خط میں تحویلِ قبلہ سے متعلق ایک رباعی لکھی جس کا لہجہ میرے نزدیک ٹھیک نہیں تھا۔ چونکہ ہمارے درمیان بے تکلفی کا تعلق تھا، میں نے اس پر انہیں توجہ دلائی۔'' (ص:۱۶۲)

مالک رام یاس یگانہ کے آخری سالوں میں ان سے ملاقات کرتے ہیں تو کچھ دیوانگی کے آثار محسوس کرتے ہیں:

> ''میں نے دیکھا مذہب کے بارے میں ان کی رائے میں بہت شدت آ گئی ہے۔ وہ جس طرح سے اور جس لہجے میں بات کر رہے تھے اس سے میرے دل میں ایسا شبہ گزرا کہ کم از کم اس پہلو سے ان کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے۔ جب مجھے یہ احساس ہوا تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر زیادہ بات چیت ہو کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اناپ شناپ باتیں نہ کرنے لگیں۔ لہٰذا میں نے بالطائف الحیل گفتگو کا موضوع بدل دیا اور ہم ان کے کلام پر باتیں کرنے لگے لیکن یہ بھی میری غلطی تھی کیونکہ اگر وہ مذہب کے بارے میں ایک انتہا پر تھے تو اپنی شاعری کے بارے میں دوسرے سرے پر تھے۔ اس پر بھی انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے ان کے پورے پس منظر کو جانتے ہوئے بھی مجھے کچھ تعجب ہوا۔ ان کی باتوں سے مجھے یوں معلوم ہوتا تھا گویا

kitaabiyat.blogspot.com

شعران سے پہلے کسی نے کہا ہی نہیں اور ''آیاتِ وجدانی'' اردو
شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ میں دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا
کہ کتنا طباع شاعر، کیسا ذہین اور قابل دماغ، کتنا وسیع المطالعہ
اور فاضل شخص زمانے کی بے مہری اور غفلت کے ہاتھوں تباہ
ہوا ہے کہ آج وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔'' (ص:۱۶۳)

خاکہ مشاہدات کی بنیاد پر لکھا جاتا ہے اس لیے خاکہ نگار کی ذات کی موجودگی یقینی امر ہے لیکن یہ نہ ہو کہ ہر جگہ وہ ہی جلوہ گر ہو اور ممدوح پیچھے چلا جائے۔ مالک رام اگرچہ اپنے مشاہدات کی بناء پر ہر خاکے میں نظر آتے ہیں لیکن ایک حد تک۔ انہوں نے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر مقام پر ان کا ممدوح ہی حاوی ہے اور یہی اچھے خاکے کی علامت ہے۔

مالک رام کے خاکوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کا عہد اور اس سے وابستہ بہت سی شخصیات زیر بحث آتی ہیں۔ ہم پس منظر، پیش منظر اور دیگر جزئیات سے آگاہ ہوتے ہیں۔

سائل دہلوی، صدر یار جنگ، برج موہن دتاتریہ کیفی اور جگر مراد آبادی کے حوالے سے لکھے گئے خاکے قاری پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں لیکن یگانہ چنگیزی لکھنوی کا خاکہ یاس کی انفرادیت اور المیہ انجام کے سبب زیادہ پُر اثر ہے۔

نواب سائل دہلوی کا خاکہ اتنا جاندار اور معلومات افزا ہے کہ ان کی شخصیت بھرپور انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ برج موہن دتاتریہ کیفی کا پہلا حصہ سوانحی مضمون ہے دوسرا حصہ خاکہ، جس کا آغاز کیفی کے خط سے ہوتا ہے۔ نیاز فتح پوری کے حوالے سے لکھی گئی تحریر کو ایک عمدہ اور اعلیٰ پائے کا مضمون تو کہا جا سکتا ہے، خاکہ نہیں کیونکہ اس میں مالک رام کی شرکت برائے نام ہے جبکہ خاکے کے لیے ضروری ہے کہ عادات واطوار کی چشم دید گواہی ثابت ہو رہی ہو۔ اس کے باوجود یہ مضمون دلچسپی سے خالی نہیں۔ اسی طرح ''غلام

رسول مہر'' کو بھی سوانحی مضمون کے درجے میں رکھا جائے گا۔ اگرچہ اس میں ممدوح کی شخصیت بھرپور طریقے سے سامنے آتی ہے لیکن کوئی بھی شخص مطالعے کے بل بوتے پر ایسا مضمون لکھ سکتا ہے۔ اس میں غلام رسول مہر کی شخصیت سے زیادہ فنی خدمات پر اظہار خیال کیا گیا ہے جبکہ خاکے میں شخصیت فن پر حاوی ہوتی ہے۔

مالک رام کے خاکوں میں ضمنی شخصیات کا ذکر بھی آتا ہے۔ وہ برسبیل تذکرہ یا جملہ معترضہ کے طور پر بھی شخصیات کے حوالے سے معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن بہت سے ادیبوں کی طرح بہکتے نہیں، جلد ہی اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس طرح خاکے کا حسن تباہ ہونے سے بچ جاتا ہے۔

مالک رام کے خاکوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کے ذریعے شخصیت کی نفسیات ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ وہ خود کوئی رائے نہیں دیتے بلکہ قاری ممدوح کی نفسیات سے خود بخود آگہی حاصل کر لیتا ہے۔ شملہ میں سائل دہلوی کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

''۱۹۳۷ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ ہال سے نکل رہے
تھے تو کسی نومشق نے پوچھا کہ دلی میں آپ کا پتہ کیا ہے جس پر
آپ کی خدمت میں خط لکھا جا سکے۔ یک دم کھڑے ہو گئے اور
ہاتھ کی لکڑی کو زمین پر مارتے ہوئے چمک کے بولے ''میاں
صاحبزادے! خط پر صرف ''سائل، دلی'' لکھ دینا، مجھے مل
جائے گا۔'' (ص:۱۷۱)

اس واقعے کو پڑھ کر قاری فوراً اندازہ لگا لیتا ہے کہ سائل کو اپنی اہمیت، شہرت اور بڑائی کا غیر معمولی احساس تھا۔

جگر مراد آبادی کا خاکہ خاصا طویل ہے۔ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ فاضل خاکہ نگار جگر کے کلام کی خوبیاں بیان کرنے لگتے ہیں۔ ان کا تجزیاتی تبصرہ ایک ڈیڑھ صفحے پر محیط

kitaabiyat.blogspot.com

ہے۔ اگر چہ خاکوں میں تنقیدی رنگ کو پسند نہیں کیا جاتا لیکن یہاں فنی تبصرے کو اس لیے برداشت کیا جاسکتا ہے کہ لکھتے وقت مالک رام کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ خاکہ لکھ رہے ہیں ورنہ وہ لوازم کا ضرور خیال رکھتے۔ ویسے بھی ۲۶ صفحات کے خاکے میں ڈیڑھ صفحے کی تنقیدی آمیزش زیادہ بری نہیں لگتی اور صرف اسی بات پر خاکہ ماننے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ یہ اعلیٰ پائے کے خاکے کی شان کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

مالک رام کا اسلوبِ بیان سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ اس کا سبب یہ قرار دیں کہ ان کی پیدائش و پرورش پھالیہ ضلع گجرات کے ہندو گھرانے میں ہوئی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مالک رام اردو، عربی، فارسی اور علوم اسلامیہ کے عالم تھے۔ عربی و فارسی پر عبور کے سبب اس کا رنگ محاوروں، مصرعوں اور اشعار کی صورت میں نمایاں ہے جو تحریر کی شان کو دوبالا کرتا ہے۔ ان کے ہاں ٹھیٹھ اردو محاورے و روزمرے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جیسے ٹھیرا، اہلے گہلے، چوک دھانس، غائب غلہ، دھتا بتا دیا، ترکی تمام ہے وغیرہ۔

مالک رام کی تحریر کہیں بھی بوجھل دکھائی نہیں دیتی بلکہ دلآویز نقوش کے ساتھ قاری کو متوجہ کرتی ہے۔

مالک رام کے خاکے پڑھ کر قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ صلح پسندی، منکسر المزاجی اور متوازن ذہن کے عکاس ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا شمار اردو کے چند اہم خاکوں میں ہوگا۔

❁❁❁❁

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو ادب کے قدآور محققین اور نقادوں میں سے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ شخصی خاکہ نگاری میں بھی ان کا گراں قدر حصہ ہے۔ وہ یوں کہ انہوں نے اردو ادب کو آٹھ مجموعوں کی صورت میں ۶۸ خاکے دیئے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: (۱) رہ نوردانِ شوق (۲) آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صد رنگ (۴) یارانِ دیرینہ (۵) بلاکشانِ محبت (۶) غزالانِ رعنا (۷) آہوانِ صحرا (۸) شجر ہائے سایہ دار۔

پہلا مجموعہ ''رہ نوردانِ شوق'' دو سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں صرف چار خاکے ہیں۔ ''حضرت جگر مرادآبادی'' سب سے عمدہ اور اعلیٰ پائے کا خاکہ ہے۔ اس میں جگر کی تصویر کسی مشاق مصور کا شہ پارہ محسوس ہوتی ہے۔ جگر کی عادات، اطوار، مشاغل، معمولات اور افکار کی روشنی میں ہر ہر پہلو واضح ہونے سے خاکے نے توانا صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمدردانہ لہجے میں بشری کمزوریوں کے بیان نے خاکے کو متوازن بنایا ہے۔

''ڈاکٹر مولوی عبدالحق'' کو مولوی صاحب کے روز و شب کے معمولات، خیالات، نظریات اور نفسیات کے آئینہ میں تشکیل دیا گیا ہے۔ جا بجا مضمون کا انداز در آنے سے خاکے کی تاثیر مناسب حد تک زائل ہوئی ہے۔ پراثر خاکہ تشکیل دینے کے لیے اس کی خاصی کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے۔ مولوی صاحب کے ہر پہلو کی بلاوجہ تمہید اور تبصرہ ہے جبکہ خاکہ نگار کو شخصی اوصاف کے ذکر کے بعد آگے بڑھ جانا چاہیے اور ذاتی رائے شامل کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس 'خاکے' میں بہت سے ناموں کو ''ایک صاحب'' کے پردے میں رکھا گیا ہے۔ خوفِ فسادِ خلق یا پھر طبعی رواداری کے تحت ناموں کا انشاء نہیں کیا۔

kitaabiyat.blogspot.com

اس شخصیے میں مولوی صاحب کا فلسفہ مسرت بیان کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ طول بیانی نے تحریر کو بوجھل بنا دیا ہے۔

''مولانا حسرت موہانی'' اوسط درجے کا خاکہ ہے۔ گرچہ حسرت کی شخصیت کو خاصی حد تک کھنگالا گیا ہے تاہم یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ کچھ اور پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی گنجائش تھی۔

''مولانا ابوالکلام آزاد'' خاکہ نما مضمون ہے جس کی تاریخی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس تحریر سے ہمارے ہاں مولانا آزاد کے حوالے سے پائی جانے والی عصبیت کی نفی ہوتی ہے اور اصلاح کا موقع ملتا ہے۔ یہ شخصیہ قاری پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

شخصی خاکوں کے حوالے سے دوسری تصنیف ''آوارگانِ عشق'' پانچ اہلِ قلم مجاز، میراجی، ناصر کاظمی، محمد حسن عسکری اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اس کے تمام خاکے جامع اور اثر انگیزی کی خصوصیت کے حامل ہیں۔ ملاقاتوں کے احوال پر مشتمل یہ خاکے شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ''آوارگانِ عشق'' کے خاکے ثابت کرتے ہیں کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ایسے غواص ہیں جو بحرِ نفسیات میں غوطہ زن ہو کر تہہ میں چھپی اصل شخصیت کو باہر نکال لاتے ہیں۔

پیش لفظ میں اگرچہ یہ لکھا گیا ہے کہ ''یہ خاکے مختلف اوقات میں ان دوستوں کی وفات حسرت آیات پر تعزیتی مضامین کے طور پر لکھے گئے تھے۔'' جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں خاکے کا خاصا اہتمام ہے یا ڈاکٹر عبادت کے تحت الشعور میں چھپے خاکہ کے لوازم نے ان سے ایسے ''مضامین'' لکھوائے۔

''شاعرِ شہر نگاراں — مجاز'' میں اسرار الحق مجاز کی المناک زندگی کا نقشہ نہایت عمدگی سے کھینچا گیا ہے۔ اس خاکے میں مجاز بہ نفسِ نفیس ہمارے سامنے محسوس ہوتے ہیں۔ نفسیاتی تجزیے نے خاکے کو نکھارا ہے اور پر اثر اندازِ بیان نے خاکے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس خاکے کا نقش قاری کے دل و دماغ پر دیر تک ثبت رہتا ہے۔

''میراجی'' میں بھی نفسیاتی تجزیہ بحسن و خوبی کیا گیا ہے اس کے علاوہ قاری کو جکڑنے کا خاصا اہتمام ہے۔ فن کے حوالے سے بھی کچھ سطور دیکھنے کو ملتی ہیں۔

''ناصر کاظمی'' بھی دل سے لکھا گیا خاکہ ہے۔ دلچسپی کا پہلو قطعی نظر انداز نہیں ہوتا۔ ناصر کے نفسیاتی تجزیئے نے خاکے کو اجال کر انفرادیت بخشی ہے۔

''محمد حسن عسکری'' ایک معیاری خاکہ ہے جس میں عسکری کی شخصیت اپنی کمزوریوں کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ اسی طرح صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی تصویر کشی کرنے میں بھی بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

اس مجموعے کی کوئی بھی تصویر نہ تو ادھوری ہے نہ ہی بھدی۔ بلکہ بھدے خدوخال میں اس مہارت سے رنگ بھرے ہیں کہ وہ بُرے محسوس نہیں ہوتے۔ ہوسکتا ہے کہ فاضل خاکہ نگار پر معائب سے نظریں بچانے کا الزام عاید ہو۔ وہ نوکیلے اور ناتراشیدہ خاکے نہیں لکھتے۔ حسن بیان کا ہنر لغزشوں، خطاؤں اور خامیوں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ خامیوں کے بجائے شخصیت کا جز و تصور ہوتی ہیں۔ مجاز کا احمقانہ حد تک شرمیلا پن، نکھٹو پن اور شراب نوشی، ناصر کاظمی کی آوارہ گردیوں، حسن عسکری کی آدم بیزاری اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی خواتین میں دلچسپی کو اس احسن طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ کجیوں کی بجائے ادائیں تصور ہوتی ہیں۔

''جلوہ ہائے صد رنگ'' میں جوش ملیح آبادی، نیاز فتح پوری، پروفیسر حمید احمد خاں، فیض احمد فیض، بلونت سنگھ اور میر صاحب کے خاکے ہیں جن کا رنگ و آہنگ باقی تمام سے مختلف نہیں۔

''شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی'' میں جوش کی ذات کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسے پڑھ کر ہم جوش کی شخصیت کے باریک سے باریک پہلو سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ اس خاکے میں جوش کی موانست، صنفِ لطیف سے والہانہ شیفتگی، خوش اخلاقی، ہمدردی، انسان دوستی، بے باکی، تن آسانی، وضع داری، خاطر داری، بادہ خواری سمیت تمام عیوب و ہنر کو

kitaabiyat.blogspot.com

سامنے لایا گیا ہے۔ خاکہ میں نہ تو محبت وعقیدت میں ڈوب کر آنکھیں بند کی گئی ہیں، نہ ہی ناپسندیدہ رویوں پر ناک سکیڑی گئی ہے۔ معائب کو سلیقے سے بیان کرنے سے خاکے کے وقار اور قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ غیر جانبدارانہ رویہ نے اسے اعتدال و توازن کا نمونہ بنا دیا ہے۔ یہ خاکہ جوش آشنائی میں صحیح طور پر ممد و معاون ہے۔ جوش کو سمجھنے کے لیے ان کے تصورات و خیالات کے ساتھ ساتھ فن کے آئینے میں بھی پرکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جوش کے آخری عشق کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''اس میں عجیب عجیب واقعات پیش آئے اس کی تفصیل بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔'' کاش! ڈاکٹر عبادت تفصیلات لکھ دیتے کیونکہ اس عمل سے جوش کی شخصیت کا ایک بھید اور کھلتا۔ جوش کے عشقوں کے حوالے سے خاکہ نگار کے تجزیہ کو مبنی بر حقیقت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس خاکے میں جوش کی شاعری کو اس سلیقے سے سمویا گیا ہے کہ وہ شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے ورنہ خاکے میں شاعری کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ گنجائش پیدا کرنا ڈاکٹر عبادت کے فنی کمال کی دلالت کرتا ہے۔

''علامہ نیاز فتح پوری'' ممدوح کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت کا احاطہ نہیں کرتا صرف حوصلہ افزائی کے وصف کا اظہار ہے وہ بھی اپنے حوالے سے۔ جس سے خاکہ نگار کی خود نمائی کا پہلو ابھرتا ہے۔ اگرچہ 'خاکے' میں اس امر کی نفی کی گئی ہے لیکن عبارت تردید کے خلاف رائے دیتی ہے۔ خاکہ نگار کی کتب پر مولوی عبدالحق اور علامہ نیاز فتح پوری کی آراء کو خاکے کا حصہ بنانا بھی خود ستائی کے رویئے کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ یہ حوالے یہاں قطعی غیر ضروری اور بے معنی ہیں۔ یوں یہ مضمون خاکہ قرار پانے سے قاصر ہے۔

''پروفیسر حمید احمد خاں'' ایک واضح اور مؤثر خاکہ ہے جس میں خاں صاحب کے خدوخال کچھ اس طرح واضح ہوئے ہیں کہ وہ اردو کے عاشق، اپنی تہذیب و ثقافت کے علمبردار، وضعدار، نڈر، عالی ظرف، معاملہ فہم، ہمدرد، محب وطن، اصول پسند، اپنی غلطی کو تسلیم کرنے والے اور غصیل تھے۔ اس خاکے میں بھی ڈاکٹر عبادت نے اپنی خامیوں تکرار و اعادہ اور اپنی ذات کی عکاسی کو برقرار رکھا ہے۔

''فیض صاحب'' خاکے کے فنی لوازم کو پورا نہیں کرتا۔ اس شخصیے میں فیض کے تین چار شخصی پہلوؤں کم سخنی، مشرقی مزاج، یاد وطن اور تعلّی سے دوری پر بات کی گئی ہے۔ زیادہ تر فن پر اظہار خیال ہے۔ فیض کا انٹرویو بھی اس مضمون کا حصہ ہے جب کہ خاکے میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ حسب معمول ملاقاتوں اور تقاریب کا تفصیلی احوال ہے جس سے روداد نویسی کا گمان ہوتا ہے۔ آخری پیراگراف میں فیض کی کچھ خوبیاں بیان کی گئی ہیں لیکن انہیں ثابت نہیں کیا گیا۔ یہ مضمون فیض کی نقش گری سے قاصر ہے اسے سوانحی مضمون کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

''بلونت سنگھ'' بھرپور اور کامیاب خاکہ ہے۔ ڈاکٹر عبادت قاری کے دل پر بلونت سنگھ کا نقش بٹھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس خاکے سے بلونت کی دلچسپ اور عجیب و غریب شخصیت سامنے آتی ہے کہ وہ کم گو، کم آمیز، شوخ، پرخلوص، مردم شناس، لطیفہ گو، بے باک، وسیع المطالعہ، خوش خوراک، اچھے کھانوں کے متوالے، نسوانی حسن کے شیدائی اور پنجاب سے جذباتی حد تک محبت رکھنے والے انسان تھے۔

''میر صاحب'' علمی ادبی شخصیت نہیں تھے لیکن بڑے بڑے شعراء اور ادباء کے لیے باعث کشش تھے۔ منٹو تک نے ان پر مضمون لکھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ خاکہ ان کی فنی چابکدستی کا عکاس ہے۔ اس مکمل اور مؤثر خاکے کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ میر صاحب جیسی پہلو دار شخصیات اس عہد میں عنقا ہیں۔ غیر معروف شخصیت کے باوجود یہ خاکہ اپنے اندر تمام کشش سمیٹے ہوئے ہے جو اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

چوتھے مجموعے ''یارانِ دیرینہ'' میں دس اصحاب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ادبی تاریخ کا حصہ بنایا ہے۔ پہلا خاکہ ''میاں بشیر احمد'' ہے جس میں ممدوح کی متحرک تصویر سامنے آئی ہے۔ اس خاکے سے قاری میاں صاحب کی وضعداری، رکھ رکھاؤ، تہذیب و شائستگی، اخلاص، علمی ذوق، شہرت و اقتدار سے گریز، مرنجان مرنج اور غیر متنازعہ شخصیت سے آگاہ ہوتا ہے۔

kitaabiyat.blogspot.com

''ابوالاثر حفیظ جالندھری'' کو تذکرہ نگاری میں شمار کیا جائے گا کیونکہ اس مضمون میں حفیظ کی مجلسیت اور فقرے بازی کے علاوہ شخصیت کے دوسرے نقوش منعکس نہیں ہوتے۔ شوکت تھانوی کے ساتھ ٹنڈے کبابی کے واقعے سے حفیظ کی شخصیت کا کوئی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ خاکے میں غیر ضروری ہے۔ اس مضمون میں حفیظ کے فن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عبارت ممدوح اور خاکہ نگار، کے قرب تعلق کی نشاندہی کرتی ہے۔ بقول خاکہ نگار ''ان ملاقاتوں میں مجھے ان کی دلکش شخصیت کو مختلف زاویئے سے دیکھنے کا موقع ملا۔'' لیکن یہ زاویئے مضمون کا حصہ نہیں ہیں اگر ہوتے تو شاید مضمون خاکے کی صورت اختیار کر لیتا۔

''ڈاکٹر سیّد عبداللہ'' اچھا خاکہ ہے جس میں ان کی خوش مزاجی، زندہ دلی، باقاعدگی، خوش لباسی، شائستگی، تہذیب، رواداری، عاجزی، اعلیٰ ظرفی، روشن خیالی، بڑائی، کسر نفسی، رومانویت اور حوصلہ افزائی کے وصف سے آگہی ہوتی ہے۔ خاکے کا پہلا جملہ ہے ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود اچھے انسان ..... تھے'' ممدوح کی کمزوریوں سے واقفیت کے باوجود خاکے میں ان سے پہلوتہی کی گئی ہے۔

''پروفیسر سیّد وقار عظیم'' بھی معقول خاکہ قرار دیئے جانے کا حقدار ہے۔ اس میں پروفیسر صاحب اپنی تمام تر رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ البتہ ان کے فنی پہلو کو جدا رکھا جانا چاہیے تھا۔

''پروفیسر سیّد وزیر الحسن عابدی'' ایک مؤثر تحریر ہے جو ممدوح کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی داستانِ الم ہے۔ یہ مضمون بہت سوں کی طرح یونیورسٹی نامہ ہے۔ عابدی کی ذات سے زیادہ ان کے علمی مقام اور کارکردگی پر اظہارِ خیال ہے، ساتھ ہی اپنی خدمات کا بھی تذکرہ ہے۔ خاکہ نگار کو عابدی کی علمیت، رنج والم اور صبر و رضا کے علاوہ بھی دوسرے پہلوؤں کو سامنے لانا چاہیے تھا۔

''مولانا نور الحسن خاں'' اچھا خاکہ ہے جس میں مولانا اپنے پورے وجود کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ''ڈاکٹر عبداللہ چغتائی'' بھی عمدگی کی صفت کا حامل خاکہ ہے۔

فاضل خاکہ نگار ممدوح کی لپک جھپک شخصیت کی تصویر کشی میں سرخرو ہوئے ہیں۔

''ڈاکٹر برکت علی قریشی'' خوبصورت اور تادیر یاد رہنے والا خاکہ ہے یہ اتنی مہارت سے لکھا گیا ہے کہ اَن دیکھے ہونے کے باوجود ڈاکٹر برکت اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔

''ڈاکٹر صابر علی خاں'' بھی عمدہ قلمی تصویر کشی کا مظہر ہے جس سے ڈاکٹر صابر کی ملنساری، خدمت خلق، اخلاص اور بزدلی کی حد تک احتیاط پسندی کا پتہ چلتا ہے۔ گرچہ خاکے میں ممدوح کی عائلی زندگی کے حوالے سے کچھ نہیں لکھا گیا۔ تاہم ماحول سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف مجرد تھے۔

''میاں مہر دین'' لکھ کر مولوی عبدالحق کی روایت کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ اس میں ''نام دیو مالی'' کی خوشبو آتی ہے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ خاکے کی رو سے جب مہر دین زندہ ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کام کر رہے ہیں تو پورے خاکے میں ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ حال کا کیوں نہیں؟

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے پانچویں مجموعے کا نام ''بلاکشانِ محبت'' ہے جس میں دس اہلِ علم و ہنر کی قلمی تصویریں ہیں۔ پہلی تصویر مولانا صلاح الدین احمد کی ہے جو سوانحی مضمون کے زمرے میں آتی ہے۔ البتہ اس میں خاکے کی لہریں ضرور ہیں۔ مولانا صلاح الدین پر اس سے زیادہ پُر اثر اور وقیع شخصیے ابوالفضل صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھے ہے۔

''مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی'' ملاقات نامہ ہے۔ اس تحریر میں شخصیت پر فن غالب ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شخصیت کے حوالے سے مواد نہ ہونے کے باعث خانہ پُری کی گئی ہے۔ یہ تحریر خاکے سے کوسوں دور ہے زیادہ سے زیادہ سوانحی مضمون کا درجہ پا سکتی ہے۔

''میاں ایم اسلم'' جاندار خاکہ ہے جس میں ممدوح اپنی دلچسپ شخصیت کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں اور قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔

''پروفیسر عزیز احمد'' میں بشری کمزوریوں کے بیان نے خاکے کو اعتبار بخشا ہے۔ اس میں صرف عقیدت و محبت ہی نہیں بلکہ ہمدردانہ انداز میں خامیوں کا ذکر بھی ہے۔ اس

kitaabiyat.blogspot.com

تصویر میں نہ تو حاشیہ آرائی کی گئی ہے، نہ ہی نک سک درست کرنے کے لیے رنگ بھرے گئے ہیں بلکہ شخصیت کو بعینہٖ پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ عمل ایم اسلم کے خاکے میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ مکاتیب نے عزیز احمد کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دی ہے۔

''حبیب جالب'' ایک نامکمل تصویر ہے جس میں مہذب و شائستہ نوجوان سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ تصویر کی تکمیل کے لیے فن کا سہارا نہ ڈھونڈا جاتا تو کمی اور تشنگی کا احساس اتنا زیادہ نہ ہوتا۔ سچ یہ ہے کہ اس کی تحریر میں فاضل خاکہ نگار نے توجہ اور محنت سے گریز کیا ہے۔

''پروفیسر سراج الدین'' مناسب خاکہ ہے جس میں پروفیسر صاحب کے احسن پہلوؤں کے بیان کے ساتھ نسوانی حسن میں غیر معمولی دلچسپی کی طرف بھی واضح اشارہ کرتے ہوئے انہیں ناگفتنی قرار دیا گیا ہے جس نے اس مجسمہ خیر کو انسانی روپ بخشا ہے۔ اس خاکے کو پڑھ کر پروفیسر صاحب کے ظاہر و باطن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اورنٹیل کالج کے یونین صدر پر قاتلانہ حملے کا واقعہ بے محل ہے۔ اس میں سراج صاحب کی بصیرت سے زیادہ خاکہ نگار کی کارکردگی کا اظہار ہوتا ہے۔

''ڈاکٹر نذیر احمد'' ایسا شخصیت نامہ ہے جس میں ممدوح کی درویشی، علم دوستی، ہمدردی اور مخلصانہ برتاؤ کے علاوہ بیان کردہ دیگر پہلوؤں کو واقعات کی روشنی میں ثابت نہیں کیا گیا۔

''پروفیسر خواجہ صلاح الدین'' کو اچھا خاکہ قرار دیا جا سکتا ہے جو بھلائی کے ایک اور تقسیم کار ہیں۔

''مولانا امتیاز علی خاں عرشی'' ایسا ملاقات نامہ ہے کہ جس سے خاکہ کشید کرنے کی کسی حد تک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

''مولانا سیّد مرتضیٰ حسین فاضل'' میں شخصیت کے دو تین زاویوں لکھنوی تہذیب کا نمائندہ، مذہبی اقدار کا پاسبان اور سادہ لوحی کو سامنے لایا گیا ہے۔ علمی مقام پر زیادہ سطور وقف ہیں۔ شخصیت کے حوالے سے تشنگی کا گہرا احساس پایا جاتا ہے اس لیے یہ تحریر خاکہ نما کے

درجہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

چھٹا مجموعہ ''غزالانِ رعنا'' بارہ خاکوں پر مشتمل ہے جو جون ۱۹۹۰ء میں چھپا۔ پہلا خاکہ ''سیّد آغا حسن عابدی'' ہے یہ مؤثر اور قاری کو گرفت میں لینے والا ہے۔ خاکہ نگار کے ممدوح سے قرب تعلق نے اسے توانائی بخشی ہے تاہم ملازمتی ذمہ داریوں، ترکی کے لوگوں اور اپنے ادبی منصوبوں کے اذکار بے محل محسوس ہوتے ہیں جب کہ آخری اڑھائی صفحات میں پچھلی سطور میں کی گئی باتوں کو دہرایا گیا ہے۔ اس مقام پر زبردستی طول دینے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

''پروفیسر سیّد نور الحسن'' سوانحی مضمون ہے۔ اس میں ممدوح کے علمی و سیاسی مقام کے ساتھ ساتھ ایک مخلص دوست کے علاوہ شخصیت کا کوئی اور پہلو سامنے نہیں آیا۔ اس خلاء کو سوانحی مواد سے پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سیّد نور الحسن اور ڈاکٹر عبادت کے درمیان پاکستان میں ہونے والی ملاقات کی تفصیلات بھی خاکے کے لحاظ سے قطعی غیر ضروری ہیں۔

''مرزا منان اللہ بیگ'' کو اوسط درجے کا خاکہ کہا جا سکتا ہے جس میں منان کی عادات، اطوار، سرگرمیوں، مزاج اور زندگی کی بدلتی رتوں سے نقاب کشائی کی گئی ہے۔ ایک دو مقامات پر نگاہیں استفہامیہ بن جاتی ہیں۔ منان کی فوجی زندگی کے حوالے سے ذکر تو ہے لیکن عہدہ نہیں بتایا گیا۔ صرف یہ لکھا ہے کہ فوج میں رہتے، جنرل کے عہدے پر ضرور فائز ہوتے۔ نہ ہی ان کے آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے کاروبار کی تفصیل ہے۔ ان کے ادبی شعور کا تذکرہ بھی ٹھونسنے کا عمل دکھائی دیتا ہے۔

''پروفیسر مرزا محمود بیگ'' ایک فرشتہ سیرت اور مثالی انسان کا دل نشیں خاکہ ہے۔ یہ دلی کے شرفاء کی مٹتی ہوئی تہذیب کا ایسا نمائندہ کردار ہے جس میں کوئی ٹیڑھ پن یا کجی نظر نہیں آتی۔

''ڈاکٹر خورشید احمد فارق'' ایک دلچسپ اور جاندار خاکہ ہے۔ ہر زاویے سے شخصیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ محبت و دل بستگی کے باوجود کمزوریوں کو بھی ہمدردانہ انداز میں

kitaabiyat.blogspot.com

پیش کیا گیا ہے۔ اینگلو عربک کالج دہلی کی تاریخی اہمیت کے حوالے سے سطور بہت سے خاکوں میں ایک جیسی ہیں۔ ایک کتاب میں ایک ہی بات کو بار بار پڑھنے سے کوفت ہوتی ہے۔ کتب کی تدوین کے وقت اس بات کا اہتمام کیا جانا چاہیے تھا کہ یکساں قسم کے مندرجات کو حذف کیا جائے یا عبارت کو نیا پیرہن دیا جائے۔

''ایئر کموڈور سید انعام الحق'' دلکش خاکہ ہے ممدوح کی مکمل تصویر سامنے آئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یک دم ختم ہونے کا احساس بھی ابھرتا ہے۔

''استاد سبطی'' مولوی عبدالحق کے ''نام دیو مالی'' کے تتبع میں لکھا گیا خاکہ ہے۔ جس میں اینگلو عربک کالج کے ہیڈ باورچی کی شخصیت سے خاصی آگہی ہوتی ہے لیکن تشنگی بھی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا ایک اور خاکہ ''میاں مہر دین'' اس سے زیادہ توانا اور پُر اثر ہے۔

''پروفیسر سی ایچ فلپس'' میں گرچہ ممدوح کی تصویر ابھری ہے لیکن انداز بیاں مضمون کا سا ہے۔ ملاقاتوں اور کانفرنسوں کے احوال کی بجائے تصویر کشی میں ممد و معاون بننے والے خطوط کو نمایاں کیا جانا چاہیے تھا۔ فلپس کی گفتگو کے آئینے میں خاکہ نگار خود جلوہ گر ہیں۔ صرف یہیں نہیں اور بہت سے مقامات پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ فاضل خاکہ نگار ممدوح کی زبان سے کی گئی اپنی تعریف کو خاکے میں سمونے کا فن جانتے ہیں۔

''رالف رسل'' عمدہ خاکہ ہے جس میں رالف کے رویئے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

''مارا استیپانیس'' ایسی دلچسپ تحریر ہے جسے خاکہ نما کہا جاسکتا ہے۔ گرچہ یہ صرف دو ملاقاتوں کا احوال ہے لیکن موصوفہ کی شخصیت کو اس ہنرمندی سے سامنے لایا گیا ہے کہ قاری بہ نفس نفیس سامنے موجود محسوس کرتا ہے۔

''پروفیسر سوخاچیف'' کو خاکہ کے بجائے ''ملاقات نامہ'' کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس میں ایک ملاقات مکالمے کی شکل میں دی گئی ہے جو بچگانہ سی تحریر لگتی ہے۔ اگر اختصار کے ساتھ ضروری ضروری باتیں بیانیہ انداز میں دے دی جاتیں تو تحریر زیادہ مؤثر ہوتی۔ مصنف

کے لیے سوخاچیف کے توصیفی جملے بہت کھلتے ہیں یوں لگتا ہے کہ اس مضمون کا مقصد ہی ذات کی نمائش ہے۔

''آر۔ ای۔ ڈی ٹیلبٹ'' ایک غیر علمی شخص کا مختصر مگر جامع اور پُر اثر خاکہ ہے۔ جس میں ممدوح احسن رویوں کے باعث اعلیٰ انسانی اقدار کے نمونے کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ دوران مطالعہ ٹیلبٹ اپنے پورے وجود کے ساتھ آس پاس محسوس ہوتے ہیں۔

''آہوانِ صحرا'' ڈاکٹر عبادت بریلوی کے شخصی خاکوں کا ساتواں مجموعہ ہے جس میں ۱۴ شخصیات کی قلمی تصویریں ہیں جن میں پانچ شاگرد اور بیشتر رفقائے کار ہیں۔ پہلا مضمون ''ڈاکٹر تاثیر'' کے عنوان سے ہے جس میں خاکے کی لہر دکھائی دیتی ہے۔ خاکہ نگار نے اپنی تصانیف کے حوالے سے بھی تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے جو یقیناً خاکے کے اصولوں کو پس پشت ڈالنے کے مترادف ہے۔

''پروفیسر خواجہ منظور حسین'' میں شخصیت کا ہیولا ضرور ابھرا ہے لیکن ذات کے تمام رنگ سامنے نہیں آئے۔ سارا زور علمی مقام و مرتبے پر صرف کیا گیا ہے۔ شخصیت کو کھنگالنے کی بھرپور سعی نہیں کی گئی۔ اسلوب کے لحاظ سے بھی یہ تحریر مضمون نویسی کے دائرۂ کار میں آتی ہے۔

''مولانا حامد علی خاں'' میں شخصیت کے نقوش تو ابھرتے ہیں لیکن مکمل تصویر کشی میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ فنی لحاظ سے یہ مضمون خاکہ نما قرار پاسکتا ہے۔

''پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر'' ایک معقول خاکہ ہے جس میں شخصیت کو جاننے اور پہچاننے کے مواقع میسر ہیں۔ خاکہ نگار اپنے ممدوح کی خامیوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

> ''ان میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں لیکن کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں۔ انسان تو خطا کا پتلا ہے۔ میں باقر صاحب کی ان کمزوریوں اور خطاؤں کا خاموش تماشائی رہا اور ان کمزوریوں کو ان کی نفسیاتی الجھنوں پر محمول کر کے ہمیشہ ان سے چشم پوشی کرتا رہا۔ اس کی تفصیل ناگفتنی ہی رہے تو بہتر ہے۔''

Kitaabiyat.blogspot.com

ان سطور بالخصوص آخری جملے میں نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ گئے ہیں ورنہ یہ سطور لکھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔

''ڈاکٹر رانا احسان الٰہی'' میں بطور استاد اور سکالر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ خدمات اور انتظامی صلاحیتوں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھی منظر عام پر لایا گیا ہے لیکن اس حوالے سے معلومات محدود ہیں کہ ڈاکٹر رانا احسان الٰہی ایک عام آدمی کی نظروں میں کیسے تھے۔ اس سب کچھ کے باوجود یہ تحریر خاکے سے قریب تر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر طارق سومرو ترکی کے سائنسدان اور انقرہ یونیورسٹی کے ریکٹر تھے۔ ان کے حوالے سے لکھا گیا مضمون ملاقات نامہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور خاکے کے تقاضے پورے کرنے سے یکسر قاصر ہے۔

''ڈاکٹر شوکت بولو'' ایک دلچسپ خاکہ ہے جو انقرہ یونیورسٹی شعبہ اردو کے ایک استاد کے حوالے سے ہے اس میں شوکت کی مکمل اور بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے البتہ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ جب شوکت زندہ ہیں تو عبارت میں ان کے لیے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خاکہ کے ابتدائی جملے بھی کچھ بھلے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ خاکہ نگار کی اپنی ذات پر ضرب لگاتے محسوس ہوتے ہیں یوں لگتا ہے کہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے یہ جملے لکھے گئے ہیں۔ عبارت ملاحظہ ہو:

> ''حکومت پاکستان کی طرف سے جب مجھے انقرہ یونیورسٹی میں اردو اور پاکستان کی تہذیب و ثقافت کی پروفیسری کا آفر ملا تو پہلے تو میں نے معذرت کی لیکن جب حکومت نے اصرار کیا تو میں نے ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کے پیشِ نظر اس کو قبول کرلیا۔''

''سیّد انور حسین شاہ نفیس رقم'' ایک نیک سیرت انسان کا عمدہ خاکہ ہے۔ موصوف ڈاکٹر عبادت کے شاگرد بھی ہیں۔

''ڈاکٹر عبیداللہ خاں'' جاندار خاکہ ہے جس میں تصویر کے دونوں رخ ہیں۔ ہمدردانہ انداز میں بیان کی گئی بشری خامیوں سے خاکے کو جلا ملی ہے۔ ڈاکٹر عبیداللہ بھی خاکہ نگار کے صحیح معنوں میں شاگرد رشید ہیں۔

''ڈاکٹر سیّد ناظر حسن زیدی'' کا مواد شخصیت کو سمجھنے میں مناسب حد تک مدد دیتا ہے۔ قباحت یہ ہے کہ ممدوح کے پہلو بہ پہلو خاکہ نگار اپنے بھی درشن کراتے ہیں۔ ان کا قلم بار بار بہکتا ہے اور بہاؤ اپنی ذات کی جانب ہو جاتا ہے۔ اس عمل نے خاکے کے معیار کو متاثر کر کے اسے تیسرے درجے کے خاکوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

''ڈاکٹر سہیل احمد خاں'' کے عنوان سے لکھی گئی تحریر میں ممدوح کو اچھا استاد، منتظم، معاون و مددگار ظاہر کرتے ہوئے ان کے علمی کمالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ذات کے دیگر گوشوں پر چند سطور ہیں۔ خدمات بیشک گنوائی جانی چاہیں لیکن تصویر کشی میں معاون خطوط کو بھی ابھارنا چاہیے۔ مرکز و محور ذات رہنی چاہیے، فن نہیں۔ پھر بھی یہ مضمون خاکے سے قریب تر ہے۔

''احراز الحسن نقوی'' ایک معقول خاکہ ہے جو اثر انگیزی کی خصوصیت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں احراز کے محاسن اجاگر ہوئے ہیں۔

''حکیم حافظ جلیل احمد'' میں کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے جس کے سبب اسے کافی بہتر خاکوں میں شمار کیا جائے گا تاہم اور بہت سے خاکوں کی طرح اس میں بھی بعض باتوں کو دہرایا گیا ہے۔

''افتخار عزیز'' میں صرف علمی ذوق کا پہلو سامنے آیا ہے۔ یہ تحریر مضمون تو ہے خاکہ ہرگز نہیں۔ اس کی شمولیت بھی کتاب پر حرف آنے کے مترادف ہے۔

''آہوانِ صحرا'' کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ یہ خاکے کے اعلیٰ معیار کو چھونے سے قاصر رہا ہے۔

''شجر ہائے سایہ دار'' ڈاکٹر عبادت بریلوی کے شخصی مرقعوں کا آٹھواں مجموعہ ہے۔ اس کے بعد ان کی زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ کچھ اور مجموعے سامنے آتے۔ دو تین کے

kitaabiyat.blogspot.com

ناموں کا تو انہوں نے اعلان بھی کر دیا تھا۔ ''شجر ہائے سایہ دار'' میں سات قلمی تصاویر ہیں پہلی قائداعظم محمد علی جناح کی ہے۔ یہ تحریر ہیئت کے اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل مضمون تو ہے، خاکہ ہرگز نہیں۔ ڈاکٹر عبادت نے قائداعظم کو چند بار جلسوں میں دیکھا تھا۔

''بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق'' دلچسپ مضمون ہے۔ اس میں خاکے کی ہلکی سی لہر تو دکھائی دیتی ہے لیکن خاکے کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

''رفیع احمد قدوائی'' ایک معقول اور اثر انگیز خاکہ ہے۔ رفیع کی خدماتِ جلیلہ ان کی باطنی شخصیت کی منظر کشی کرتی ہیں۔ رفیع کی کمزوریوں پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ شاید یہ پہلو محاسن کے انبار تلے دب گیا ہے۔

''پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی'' میں خاکے کی چاشنی ضرور ہے لیکن مضمون کے اسلوب اور خاکہ نگار کی خودنمائی کے عیب نے اسے مکمل اور بھرپور خاکے کا روپ دینے سے محروم رکھا ہے۔

''مولانا محمد حسین'' نہایت توانا، مؤثر اور پختہ خاکہ ہے۔ اس میں قاری مولانا کی دلچسپ شخصیت کے نمایاں رنگوں سادہ لوحی، ہمدردی، انسان دوستی، نرم مزاجی، فرض شناسی اور شفقت سے آگاہ ہوتا ہے۔

''پروفیسر سیّد احتشام حسین'' میں شخصیت کے تمام پہلوؤں کو سامنے لانے کے بجائے صرف شفیق استاد پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے۔

''جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن'' بھی اوسط درجے کا خاکہ ہے کیونکہ شخصیت سے سطحی سی آگہی ہوتی ہے۔ خاکہ نگار ذات کے سمندر میں اتر کر گہر کی خبر نہیں لاتے بلکہ سطح آب پر پیدا ہونے والے حبابوں کی دلکشی کی خبر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ شاید اس وجہ سے ہے کہ ڈاکٹر عبادت کی ایس۔ اے رحمان سے بے پناہ قربت نہ تھی۔ ان کے احسانات اور منصف مزاجی کے سبب یہ شخصیہ لکھا گیا۔ خاکہ نگار نے اپنی ذات کی نمائش کا یہاں بھی خوب اہتمام کیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے تمام خاکوں کا ماحول گہری سنجیدگی کا حامل ہے۔ وہ

انسانی کمزوریوں پر نظریں جمانے کے بجائے کنی کتراتے دکھائی دیتے ہیں تاہم جو کمزوریاں شخصیت کا جزو لاینفک ہیں ان کے بیان میں رویہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔ حسنِ بیاں ان کمزوریوں کو نشانۂ ملامت بننے سے روکتا ہے۔ عام طور پر قاری شخصیات کے احترام میں برابر کا شریک ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت کے خاکے ان کی سنبھلی ہوئی نفسیات، ٹھہراؤ اور معتدل مزاجی کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ اگرچہ بعض مقامات پر عہد جوانی میں اپنے اشتعال انگیز ہونے کا ذکر کرتے ہیں لیکن خاکوں سے کہیں بھی مغضوب الغضب ہونے کا تاثر نہیں ملتا۔ ان پر تقسیم کے واقعات اور اس کی اتھل پتھل کا گہرا اثر ہے۔ بعض شخصیت ناموں میں لاشعوری طور پر اس کا اظہار ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے میاں بشیر احمد، حفیظ جالندھری، عزیز احمد اور بعض دوسرے خاکوں میں مکمل خطوط شامل کیے ہیں۔ اگرچہ یہ خاکے کی معروف روایت نہیں لیکن چونکہ ڈاکٹر عبادت لیجنڈ ہیں اس لیے انہیں جدتیں پیدا کرنے کا حق حاصل ہے۔ تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ بعض خطوط غیر ضروری محسوس ہوتے ہیں۔ اگر وہ نہ بھی دیئے جاتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔

ڈاکٹر عبادت کے خاکوں کی زبان شستہ، سادہ، رواں اور دل میں اترنے والی ہے۔ ناہموار الفاظ، محاورات اور جملے لکھنے سے بچتے ہیں۔ البتہ ترکیب ''گل افشانی گفتار'' کو اتنی کثرت سے بروئے کار لایا گیا ہے کہ تکیہ کلام کا گمان ہوتا ہے۔

فن اور شخصیت الگ الگ موضوعات ہیں۔ خاکہ شخصیت سے عبارت ہے فن سے نہیں۔ فن کا معمولی سا ذکر تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا پھیلاؤ خاکے کو مجروح کرتا ہے جب کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاں اس کا خاص اہتمام ہے بلکہ دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خاکہ لکھ رہے مضمون نہیں۔

رسمی، وضاحتی اور منکسرانہ جملوں کو خاکے کا حصہ بنانے سے گریز کرنا چاہیے جبکہ

kitaabiyat.blogspot.com

ہمارے فاضل خاکہ نگار کے ہاں یہ سب کچھ اپنی تمام تر ''رعنائیوں'' کے ساتھ موجود ہے۔

خاکہ نگار کو شخصیت کے رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے کسی پہلو یا ادا پر تبصرہ یا وضاحتیں نہیں کرنی چاہیں لیکن ڈاکٹر عبادت اس معاملے میں خاصے غیر محتاط دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خاکے کفایت لفظی کے محتاج ہیں۔ بات اور صورتحال کو طول دے کر خاکے کو بوجھل بناتے ہیں۔ اعترافِ فن، شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا جذبہ اور خواہ مخواہ کے تبصرے ان کے خاکے کو مضمون کی شکل دیتے نظر آتے ہیں لیکن تھوڑے سے مقام کے بعد خاکہ پھر اپنے رنگ و آہنگ کے ساتھ بہار دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بیشتر خاکوں میں یہ بات موجود ہے کہ جس سے بھی ان کی پہلی ملاقات ہوئی ہے وہ اس کے سحر میں گم ہو گئے۔ یعنی ان میں کسی سے جلد متاثر ہو جانے کی کمزوری موجود تھی۔ جب کہ خاکہ نگار کو عالمِ سحر سے نکل کر کھلی آنکھوں اور کشادہ ذہن کے ساتھ شخصیت کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ مدہوش خاکہ نگار پر شخصیت کے جمالیاتی پہلو غالب آ جاتے ہیں اور ایسا ہمارے فاضل خاکہ نگار کے ساتھ اکثر ہوا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خاکوں میں جملوں، خیالات اور موضوعات کی تکرار بہت زیادہ ہے۔ ایک ہی مضمون میں باتیں بالکل اسی طرح دہرائی جاتی ہیں جیسے بزرگ ایک ہی شخص کے سامنے اپنی یادوں کو دہراتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ پہلے بھی انہیں کئی بار سنا چکے ہیں۔ ''شجر ہائے سایہ دار'' میں اس کا اہتمام کچھ زیادہ ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ کتاب عمر کے آخری حصے میں لکھی گئی ہے اگر توجہ سے نظر ثانی کی جاتی تو یہ عیب اشاعتی صورت میں قارئین تک منتقل نہ ہوتا۔

خاکے میں یہ احتیاط برتنی پڑتی ہے کہ خاکہ نگار زیرِ بحث شخصیت کے تذکرے میں خود کو پس منظر میں رکھے۔ دانستہ تو خیر عیب ہے ہی، نادانستہ طور پر بھی خود نہ جھانکنے لگے۔ انتہائی ضروری مقام پر سامنے آئے لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی اس لازمے کو پورا کرنے میں بُری طرح ناکام رہے ہیں۔ وہ بار بار اور خوب خوب جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ ممدوح کی زبان

اور قلم سے اپنے آپ کو اتنی بار سامنے لاتے ہیں کہ قاری کو الجھن سی ہونے لگتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایک جگہ لکھا ہے ''میں اپنی کتابوں کے ذکر سے بہت پریشان ہوں اپنی تعریف سے مجھے سخت الجھن ہوتی ہے۔'' (آہوانِ صحرا۔ ص:۱۵۳) لیکن آٹھوں مجموعوں میں رویہ قطعی مختلف ہے ان کی ہر ممکن کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی اعلیٰ خدمات کو قاری کے ذہنوں پر نقش کیا جائے۔ کبھی وہ ممدوح کی زبان سے اپنے لیے توصیفی کلمات ادا کرواتے ہیں اور کبھی خود خدمات جلیلہ کو گنواتے ہیں۔ حالانکہ انہیں زندگی میں ہی شناخت اور پذیرائی ملی۔ اس لیے اس خامی کا در آنا عجیب سی بات لگتی ہے۔ عین امکان ہے کہ یہ سب کچھ مخالفتوں، سازشوں اور ناانصافیوں کا ردِ عمل ہو۔ شعبہ اردو کی صدارت، ڈین شپ اور پرنسپلی کا تذکرہ اتنی کثرت سے ہے کہ قاری کے ذہن پر بُری طرح ضرب لگاتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی مہمان نوازی کی تفصیلات بلا تکلف بیان کی ہیں۔ چائے، کھانا اور تحفے دینے کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے جو معیوب سا لگتا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے ایسی چھپائی جانے والی باتوں کا ڈھنڈورا پیٹنا کیوں ضروری سمجھا۔ بہر حال مجموعوں کی ترتیب کے وقت دھیان سے نظر ثانی کر لی جاتی تو بیشتر عیوب غائب ہو جاتے۔ ان تمام باتوں کے باجود ان کے وقیع کام کے سبب ان کا شمار اہم خاکہ نگاروں میں ہوگا۔

❁❁❁❁

kitaabiyat.com

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی عہد ساز ادیب و شاعر ہیں انہوں نے افسانے اور شاعری کو نئی جہتیں دیں۔ ان علوم میں وہ کامل و اکمل ہیں ۲۰۰۲ء میں ان کے خاکوں کا مجموعہ ''میرے ہم سفر'' کے نام سے منظر عام پر آیا جس میں انہوں نے تیرہ اہلِ قلم کی کہکشاں سجائی ہے۔

آیئے! قاسمی صاحب کی ہر شخصی تحریر کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ وہ خاکہ نگاری کے فن پر کس حد تک پوری اترتی ہے۔

''میرے ہم سفر'' کا پہلا مضمون ''مولانا عبدالمجید سالک'' ہے۔ اس میں شخصیت کے خدوخال خاصے ابھرے ہیں۔ قاسمی صاحب نے اگرچہ احسن پہلو بیان کیے ہیں، کمزوریوں سے گریز کیا ہے۔ اس کی وجہ سالک صاحب سے بے پناہ عقیدت ہے جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں کہ ان کے قلم کی روانی کو عقیدت نے جکڑ رکھا ہے۔ عقیدت کے سفر میں انہوں نے اندھی تقلید کی بجائے باشعور عقیدت کو ترجیح دی جس کے سبب وہ سالک صاحب کا کامیاب خاکہ لکھ پائے جس میں شخصیت کا خاصا واضح ہیولا ابھرا ہے۔

''مولانا غلام رسول مہر'' غالباً ان کی وفات پر لکھا گیا ادارتی نوٹ ہے۔ جس میں مہر صاحب کے فکر و فن کے حوالے سے یادیں ہیں لیکن ذاتی خوبیوں یا خامیوں کے حوالے سے نہیں جس کے سبب مہر صاحب کی شخصیت کی پرتیں نہیں کھلتیں۔ اس مضمون میں ہم ایک اعلیٰ ظرف عالم سے تو متعارف ہوتے ہیں، انسان سے نہیں۔ اشاعت کے وقت اس مضمون پر نظر ثانی کی جانی چاہیے تھی۔ مہر صاحب کی ذات کے حوالے سے قاسمی صاحب کی یادیں خاصی ہوں گی جن کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً احباب کی محفل میں ضرور کرتے رہے ہوں گے۔ محبت بھری اس تحریر کو خاکے کی سمت اٹھنے والا قدم تو قرار دے سکتے ہیں، خاکہ نہیں۔

''مولانا چراغ حسن حسرت'' میں ان کی لطافت طبع، بڑا پن اور حوصلہ افزائی کے پہلو سامنے آئے ہیں۔ قاسمی صاحب کی یہ یادیں حسرت کی شخصیت کو مکمل طور پر پیش کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ قاسمی صاحب کے پیشِ نظر حسرت کے خاکہ کی بجائے تاثراتی مضمون لکھنا تھا ورنہ وہ یہ ہرگز نہ لکھتے کہ

> ''اگر میری ان منتشر اور سینکڑوں میں سے صرف چند یادوں سے مولانا حسرت مرحوم کی بوقلموں شخصیت کا کوئی ایک پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے تو میں سمجھتا ہوں میں نے آپ کا وقت ضائع نہیں کیا۔'' (ص: ۴۷)

قاسمی صاحب سے بہتر کون جانتا ہے کہ خاکے میں تو پوری شخصیت کو پیش کرنا ہوتا ہے کسی ایک آدھ پہلو کو نہیں۔ جبکہ یادیں بھی بے شمار ہوں تو ان میں سے ایسی یادوں کا چننا کون سا مشکل کام ہے جس سے پورٹریٹ بن سکے۔

قاسمی صاحب کی شخصی تحریروں میں ''سعادت حسن منٹو'' سب سے اچھا خاکہ ہے۔ اگرچہ اس کے بعض مندرجات دوسری تحریروں میں بھی شامل ہیں لیکن بے جا ہرگز محسوس نہیں ہوتے۔ اس خاکے میں منٹو کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ کمزوریوں کے بیان میں اہانت ہرگز نہیں، محبت و ہمدردی کا عنصر شامل ہے جو خاکے کی مبادیات میں سے ہے۔

''ن م راشد'' میں بہت سے مندرجات سے پہلو تہی کر لی جائے تو ہم ان کی کھٹی میٹھی شخصیت سے آگاہ ہوتے ہیں اور راشد سے متعلق وہ ذکر ہی خاکہ قرار پائے گا۔ کاش! غیر ضروری مواد نہ ہوتا اور اختصار و جامعیت سے کام لیا جاتا تو عمدہ خاکہ تشکیل پاتا۔ اس شخصیے میں قاسمی صاحب کی اپنی ذات زیادہ جلوہ گر ہے۔ دہلی میں منٹو کی ڈرنک پارٹی کی آڑ میں اپنی شراب نوشی نہ کرنے کے ذکر میں دانستگی جھلکتی ہے۔ اس محفل کی پوری تفصیل میں راشد کی شخصیت کا کوئی پہلو سامنے نہیں آتا۔ اسی طرح ۱۹۴۵ء کے پشاور میں قیام کے تذکرے میں بھی قاسمی صاحب ممدوح سے زیادہ خود نمایاں ہیں۔ قاسمی صاحب کی شاعری

kitaabiyat.blogspot.com

سے متعلق ن م راشد کا خط بھی خاکے میں غیر ضروری ہے کیونکہ اس سے راشد سے زیادہ قاسمی صاحب کی شخصیت ابھرتی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں دہلی ریڈیو کے مشاعرے کی تفصیل غیر ضروری ہے ان تمام امور کو مشاقی و اختصار کے ساتھ پیش کیا جا سکتا تھا کہ بات بھی ہو جاتی اور زیرِ نظر شخصیت اوجھل نہ ہوتی۔

''فیض احمد فیض'' طویل ترین مضمون ہے جس میں فیض کی شخصیت سے زیادہ قاسمی صاحب کا اپنا احوال ہے۔ غیر ضروری واقعات کی بھرمار ہے۔ اس باب میں فیض کی شخصیت کی بجائے 'انجمن ترقی پسند مصنفین میں فیض کا کردار' پیش کیا گیا ہے۔ طوالتِ بیان نے قاسمی صاحب کو یہاں بھی بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ جس کے سبب وہ خاکے کے کوسوں دور چلے گئے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف ایک ہی بات رہ گئی ہے کہ فیض کے حوالے سے ترش باتوں کو ضبطِ تحریر میں لا کر تاریخ کا حصہ بنایا جائے۔ قاسمی صاحب ان یادوں میں اپنی وضعداری برقرار رکھنے میں ناکام رہے ہیں کوشش کے باوجود بھی اپنی روادارانہ خُو سے ہٹے دکھائی دیئے ہیں جبکہ باقی تمام شخصیات کے حوالے سے ان کا بیان ہمدردانہ ہے۔ گلے، شکوؤں، الزام تراشیوں اور بدگمانیوں پر مبنی یہ یادیں فیض کے منفی رخ کا تعین کرتی ہیں۔ یقیناً یہ سب کچھ درست ہوگا لیکن اس تحریر میں قاسمی صاحب جیسے ہوشمند اور باکمال ادیب نے خاکے کو بری طرح گھائل کیا ہے۔ ان یادوں کو خاکوں کے مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔

''سیّد ضمیر جعفری'' تقریباً آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں تین صفحات ضمیر جعفری کے فن پر وقف ہیں۔ نصف سے زائد مواد قاسمی صاحب کی اپنی ذات سے متعلق ہے۔ جبکہ باقی مواد بھی اختصار کا متقاضی ہے۔ قاسمی صاحب ضمیر کی ذات کے گرد ہی گھومتے رہتے تو اچھا خاکہ تشکیل پا سکتا تھا کیونکہ ضمیر کی ذات کے حوالے سے جتنا مواد ہے، بہت مؤثر ہے۔

''سید امتیاز علی تاج'' کے آخر میں کچھ غیر ضروری مواد ہے اس کے باوجود یہ کافی بھلا خاکہ ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔

''حکیم محمد سعید'' تقریباتی مضمون ہے جس میں ذات کی بجائے کام پر روشنی ڈالی گئی

ہے۔ اس لیے یہ کسی صورت خاکہ قرار نہیں پا سکتا۔ مضمون کے آخر میں یہ عبارت ہے کہ ''یہ تحریر حکیم محمد سعید صاحب کی موجودگی میں لاہور میں برپا ہونے والی ایک تقریب میں پڑھی گئی۔''

اس اعتراف کے باوجود اس تحریر کو خاکوں کے مجموعے میں شامل کرنا حیران کن بات ہے۔ جبکہ کتاب کی محرک و مرتبہ منصورہ احمد صاحبہ خود پائے کی قلمکار ہیں۔

''خدیجہ مستور'' کی تمہید ہی دو صفحات پر مشتمل ہے۔ صحیح معنوں میں خاکہ ان صفحات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب نے یہاں بھی شخصیت سے زیادہ فن کو موضوع بنایا ہے یا پھر خدیجہ کے افسانوں میں ان کی شخصیت کو ڈھونڈا ہے۔ عام روش تو یہی ہے کہ داخلی و خارجی رویوں سے تصویر کشی کی جائے لیکن قاسمی صاحب کی یہ اچھوتی کاوش اس لیے قابلِ تحسین ہے کہ یہ خاکے کو ایک نئی جہت عطا کرتی ہے۔

''ابن انشاء'' کے بیشتر واقعات ان کی ذات کے صرف ایک پہلو 'خوش طبعی' کے حوالے سے ہیں جبکہ دوسرے رویوں سے اغماض برتا گیا ہے۔ ابتدا ہی میں قاسمی صاحب نے کہہ دیا کہ وہ انشاء کی صرف متبسم شخصیت کو بیان کریں گے۔ کسی کی ذات کا صرف ایک پہلو، کتنا ہی نمایاں کیوں نہ ہو، خاکے کی صنف کے لیے ناکافی ہے۔

''سجاد سرور نیازی'' خاصا اثر انگیز خاکہ ہے جس میں سجاد اپنے وجود کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اس کے باوجود تشنگی کا احساس ابھرتا ہے۔

''محمد طفیل'' سے متعلق تحریر میں شخصیت کے خدوخال مناسب حد تک ابھرتے ہیں۔ طولِ بیان، اپنے بارے میں معلومات، ضمنی باتوں کے ہجوم اور طفیل کے فن پر اظہارِ خیال کے سبب ان کی شخصیت دب کر رہ گئی ہے۔ غیر ضروری مواد نکال کر صرف طفیل کی ذات سے متعلق مندرجات کو جامع انداز میں قلمبند کیا جائے تو طفیل کا خاصا بھلا خاکہ تشکیل پا سکتا ہے۔

خاکے کا مقصد ادیب و شاعر کو پیش کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر پوشیدہ عام انسان کو نکال کر باہر کرنا ہوتا ہے جبکہ قاسمی صاحب فنکار کو بطور انسان پیش کرتے کرتے اکثر اس کے فن کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے جس سے خاکے کی روح متاثر ہوئی۔

kitaabiyat.blogspot.com

خاکہ نگاری میں انسانی محاسن کے ساتھ ساتھ بشری کوتاہیوں کی جانب بھی فنکارانہ انداز میں اشارے کیے جاتے ہیں۔ قاسمی صاحب کی شخصی تحریریں بزرگوں کے حوالے سے محبت بھری ہیں جبکہ بعض ساتھیوں کی کمزوریوں کی ہمدردانہ انداز میں نشاندہی کی گئی ہے۔ فیض صاحب کے معائب بیان کرتے ہوئے ان کی مٹھاس میں واضح طور پر کمی آ گئی ہے۔

قاسمی صاحب وضعدار بزرگ ہیں۔ انہوں نے اپنے احباب کے ذکر کے دوران القابات کا خیال رکھا ہے لیکن ان کی تکرار کچھ بھلی معلوم نہیں ہوتی اور جب بار بار ''میرے عزیز دوست سعادت حسن منٹو'' لکھتے ہیں تو تصنع کا گمان ہوتا ہے۔ جبکہ قاسمی صاحب اس رمز سے بخوبی آگاہ ہیں کہ خاکہ نگاری سمیت کسی بھی تحریر میں غیر معمولی تکلف پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

خاکہ نویس پر لازم ہے کہ خاکے کے دوران اس کی ذات کہیں بھی نمایاں نہ ہو اور خاکوں کی آڑ میں خاکہ نگار کی تشہیری مہم کا گمان نہ ہو۔ لیکن جب ہم احمد ندیم قاسمی صاحب کے خاکوں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہمیں تقریباً ہر خاکے میں خود تحسینی کے بلوریں قلعے میں محصور دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں وہ زیرِ نظر شخصیت کی زبان یا قلم سے اپنی بڑائی کا اعتراف کراتے ہیں اور کہیں واقعات ان کی عظمت کو ظاہر کر رہے ہوتے ہیں۔ 'میں' کا عنصر قاسمی صاحب کے ہر شخصیئے میں شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔

قاسمی صاحب کی تحریریں غیر ضروری طوالت کا شکار ہیں جو اختصار و جامعیت کی متقاضی ہیں۔ اگر وہ کفایت لفظی سے کام لیتے تو یہ خامی کبھی نہ ابھرتی۔ ان کے کچھ مضامین قطع و برید یعنی ایڈیٹنگ کے محتاج ہیں تب کہیں خاکوں کا روپ دھار سکتے ہیں۔

قاسمی صاحب کی ذات پر منٹو کا گہرا نقش ہے۔ ان کی تقریباً ہر تحریر میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی بہانے منٹو آ وارد ہوتا ہے۔ بہت سے مقامات پر تو اس کی آمد غیر ضروری لگتی ہے۔

قاسمی صاحب کے شخصیوں کی نثر سادہ و رواں ہے۔ وہ لفظی بازی گری نہیں کرتے

جس کے سبب ان کی شخصی تحریریں عام قاری کے لیے بھی قابلِ قبول ہیں۔ بلند پایہ افسانہ نگار ہونے کے باوجود بھی افسانوی حربوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔ یہاں تک کہ آغاز بھی سیدھی سادی باتوں سے کرتے ہیں اور ابتدائیے کو دلکش بنانے کی شعوری کوشش نہیں کرتے۔

قاسمی صاحب نے اپنے شراب نہ پینے کا ذکر تقریباً ہر شخصیے میں کسی نہ کسی صورت میں کیا ہے۔ غیر معمولی ذکر سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انہوں نے تحت الشعور میں ابھرنے والی خواہش کی شدت کو دبانے کے لیے ایسا کیا ہے ورنہ اتنی وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔

قاسمی صاحب کے شخصی مضامین میں فکر کا چمکارا بھی پایا جاتا ہے۔ ان کی فکر اور نظریات ان کی تحریروں میں برملا ملتے ہیں جیسے:

> ''اگر کسی فنکار کی شخصیت اس کے فنی موضوعات و نظریات کی نفی کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں قباحت ہی قباحت ہے مثلاً اگر کوئی فنکار اپنے فن میں سرمایہ داری اور بڑی زمینداری کو (جسے غلطی سے جاگیرداری کے محدود مفہوم والا نام دے دیا جاتا ہے) انسان کی مادی اور روحانی ترقی کی راہ میں خوفناک رکاوٹ قرار دیتا ہے مگر عملاً وہ ان اداروں کا محافظ ہے تو میں اسے فنکار کی ریاکاری قرار دوں گا۔ اگر ایک شاعر محنت کی عظمت اور وقار کے گیت گاتا ہے مگر خود ایک تنکے تک کو توڑنے کی مصیبت سے گھبراتا ہے تو وہ خلوص کے فقدان کا شکار ہے۔ فن فنکار کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے..... فنکار کے فن اور شخصیت کے رشتے بہت گہرے ہوتے ہیں اور آپس میں اتنے الجھے ہوئے' اتنے گتھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہو تو اس کے فن کے چہرے پر بھی خراشیں پڑ جاتی

kitaabiyat.blogspot.com

ہیں اور اس کی شخصیت بھی زخمی ہو جاتی ہے'' (ص:۱۸۱)

''میرے ہم سفر'' کو پڑھ کر ہم اس نتیجے پر بآسانی پہنچتے ہیں کہ قاسمی صاحب نے جس سنجیدگی و عرق ریزی سے افسانہ لکھا ہے، وہ ان کی خاکہ نگاری میں نظر نہیں آتی۔ شخصیت سے متعلق ہر قسم کی تحریر کو خاکہ قرار دے کر مجموعے میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اگر قاسمی صاحب خاکے کے اصول وضوابط اور تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھتے تو ان کا خاکہ یقیناً فنی معراج کو چھوتا نظر آتا۔ بیک وقت خودنوشت اور خاکہ لکھنے کی سعی نے سب کچھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ کتاب کی پبلشر منصورہ احمد لکھتی ہیں:

''ایک خیال سوجھا کہ خودنوشت کا خیال تو خیالِ خام ہی ثابت ہوا
کیوں نہ ان مشاہیر کے حوالے سے بابا اپنی یادداشتیں قلم بند کر لیں
یہ بھی ایک انداز سے جزوی خودنوشت ہی ہوگی۔'' (ص:۱۱)

''.....ہم بہت دنوں سے بابا کو خودنوشت لکھنے کی تحریک کر
رہے تھے جب دیکھا کہ ان کی مصروفیات اس کی اجازت نہیں
دے رہیں تو متبادل مشورہ دیا کہ آپ اہم شخصیات کے بارے
میں لکھیں۔ اس طرح ہی ادب کی کچھ تاریخ محفوظ ہو جائے
گی۔'' (ص:۱۵)

یعنی پیشِ نظر خاکہ لکھنا نہیں بلکہ یادداشتوں کے ذریعے تاریخ محفوظ کرنا ہے۔ ایسی صورتحال میں اسلوب کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ جب خاکہ لکھنے کی شعوری کوشش ہی نہیں کی گئی تو یادوں کا سوانحی مضامین سے آگے بڑھنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس لیے ایک آدھ کے علاوہ بیشتر مضامین 'یادنگاری' کے زمرے میں آئیں گے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قاسمی صاحب خاکہ نگاری کے اثاثے میں تو کچھ اضافہ نہ کر سکے البتہ ان کی یادداشتوں کے ذریعہ ادبی تاریخ کے کچھ گوشے ضرور سامنے آئے ہیں۔

❁❁❁❁

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا کی تصنیف ''شامِ دوستاں آباد'' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ جس میں آٹھ شخصی مضامین یا خاکے ہیں۔ حیرت ہے کہ خاکہ نگاری کے تذکروں میں کہیں بھی اچھے یا برے لفظوں میں ڈاکٹر وزیر آغا کی اس خدمت کا ذکر نہیں۔ ڈاکٹر بشیر سیفی کی تصنیف ''خاکہ نگاری'' ہو یا ضیاء ساجد کی ''ممتاز ادیبوں کے منتخب خاکے'' مبین مرزا کی تین جلدوں پر مشتمل ''اردو کے بہترین شخصی خاکے'' ہو یا ڈاکٹر انوار احمد کی ''اردو کے منتخب خاکے''۔ ان سب میں آپ ڈاکٹر وزیر آغا کو غیر حاضر پائیں گے۔

''شامِ دوستاں آباد'' کے تمام مضامین خاکے نہیں۔ ۱۶ میں سے نصف کے قریب سفرنامہ، انشائیے اور آپ بیتی ہیں بقیہ نصف شخصیات سے متعلق ہیں جن کا جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

''نانا جان'' عمدہ خاکہ ہے جس کا تاثر افسانوی ہے۔ اختتام تو بالکل افسانوں جیسا ہے ہو سکتا ہے کہ اس اسلوب کے سبب کچھ نقاد اسے افسانہ گردانیں لیکن فنی لحاظ سے یہ خاکہ ہی ہے۔

''ٹوٹا ہوا تارا'' ڈاکٹر وزیر آغا کے بھانجے اور افسانہ نگار شمس آغا سے متعلق تحریر ہے جس میں شمس کی الجھی ہوئی شخصیت کی گتھیاں کھول کر سمجھانے کی نہایت اچھی کوشش کی گئی ہے۔ فنی لحاظ سے یہ اعلیٰ پائے کا خاکہ ہے۔ اسے اردو کے بہترین شخصی خاکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اے حمید نے بھی شمس آغا کا شخصیت نامہ لکھا ہے لیکن وزیر آغا جیسی بات نہیں۔

''شام دوستاں آباد'' میں مولانا صلاح الدین احمد سے متعلق دو تحریریں ''مولانا سے پہلی ملاقات'' اور ''مولانا سے میری آخری ملاقات'' کے عنوان سے ہیں۔ یہ

Kitaabiyat.blogspot.com

دونوں مضامین صرف ملاقاتوں کا احوال نہیں بلکہ ممدوح کی قلمی تصویریں ہیں۔ مؤخرالذکر ایک مکمل اور جامع خاکہ ہے اگر پہلے حصہ کو بھی ملا دیا جائے تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ عنوان بھی بدلنا ہوگا۔ ویسے موجودہ صورت میں بھی اس سے بہتر عنوان ہو سکتے تھے جیسے ''اردو ادب کا مہاتما بدھ''۔

''راجہ مہدی سے میری پہلی اور آخری ملاقات''......معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار کے ذہن میں یہ عنوان پہلے تھا۔ وہ اسی حد تک محدود رہنا چاہتے تھے کہ ان کا قلم شخصیت کی بھول بھلیوں میں نہ کھو جائے۔ اس ''جز رسی'' کے باوجود فاضل خاکہ نگار نے راجہ مہدی علی خاں کی شخصیت کو پورے وجود کے ساتھ ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ انہوں نے صرف خارج پر ہی نظر نہیں رکھی داخل میں بھی بھرپور جھانکا ہے اور اندر کے راجہ مہدی علی خاں کو قاری کے روبرو کر دیا ہے۔ منصف مزاج ناقدینِ فن اسے عمدہ خاکہ قرار دینے میں قطعی جھجک محسوس نہیں کریں گے۔

''کوہِ ندا کا مسافر'' پروفیسر حمید احمد خاں سے متعلق شخصی تحریر ہے۔ ابتدائیہ اور اختتامیہ تعزیتی مضمون کی خبر دیتے ہیں۔ وزیر آغا کا یہ جملہ بھی خاکہ سے دور رہنے کا اشارہ دیتا ہے کہ

> ''یادوں کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ میں سادہ ورق پر صرف چند ایسے نقوش ہی ابھاروں گا جن کا میری اپنی زندگی سے تعلق ہے۔''

لیکن اس کے باوجود اس شخصیت نامے میں خاکے کی لہریں دکھائی دیتی ہیں۔ اس مضمون سے ممدوح کی اولوالعزمی، ثابت قدمی، دیرینہ رفاقت، علمی شان اور روحانیت کی جانب جھکاؤ کا پتہ چلتا ہے۔

''اس مقتل میں'' مجید امجد کی وفات پر لکھا ہوا مختصر سا تاثراتی وتنقیدی مضمون ہے۔ شخصی محاسن کو بھی فن سے اخذ کیا گیا ہے اس لیے یہ مضمون خاکہ قرار پانے سے قاصر ہے۔

''برگد کا پیڑ'' پروفیسر غلام جیلانی اصغر کا مختصر و جامع خاکہ ہے۔ خاکہ نگار برگد کے استعارہ سے ممدوح کی ذات کے روشن پہلو سامنے لائے ہیں یہ خاکہ فنکارانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''شاد کا غم'' شاد امرتسری کی وفات پر لکھا گیا مختصر سا مضمون ہے جو خاکے کے خاصا قریب ہے کیونکہ اس تحریر سے ممدوح کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں سے شناسائی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے خاکوں میں حلیہ نگاری کی روایت کو مقدم نہیں جانا لیکن قطعی طور پر صرف نظر بھی نہیں کیا۔ وہ اس باب میں بھی منفرد و یکتا نظر آتے ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں کے حوالے سے یہ سطور دیکھیے:

> ''راجہ صاحب قطعاً گول مٹول تھے۔ کمرے کے عین درمیان انہوں نے ایک گول سی کرسی بچھا رکھی تھی جو راکنگ چیئر بھی تھی اس میں بیٹھ کر وہ بالکل ایک فٹ بال کی طرح نظر آتے بلکہ کئی بار مجھے یہ محسوس ہوا کہ الفرڈ ہچ کاک ہندوستانی لباس میں نمودار ہو گئے ہیں۔ راکنگ چیئر ایک طرح سے راجہ صاحب کے مختلف موڈز کا بیرومیٹر بھی تھی اور ان کے ملاقاتی راکنگ چیئر کی رفتار سے راجہ صاحب کے درجۂ حرارت کا بھی بآسانی اندازہ کر لیتے تھے۔ مثلاً اگر کسی کے آنے پر کرسی لرزہ براندام ہو جاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ راجہ صاحب کو ان کے آنے سے خوشی ہوئی ہے اور اب وہ سامنے بچھے ہوئے صوفے پر بخوشی بیٹھ سکتا ہے اور اگر کسی کا درشن پاتے ہی کرسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک جاتی اور راجہ صاحب کانشی ناتھ کر اس کے سلسلۂ نسب کے بعض نازک مقامات سے آگاہ کرنے لگتے تو ملاقاتی جان لیتا کہ مطلع صاف نہیں ہے اور پھر وہ طوفان کے آنے سے

kitaabiyat.blogspot.com

پہلے ہی ان کے سامنے سے ہٹ جاتا۔''

وزیر آغا اپنے خاکوں میں ممدوح کی نفسیات کے الجھے دھاگوں کو ملائمت سے سلجھاتے نظر آتے ہیں۔ وہ ذات کی پاتال میں اتر کر اصل شخصیت کا سراغ لگاتے ہیں جس سے عموماً ممدوح بھی بے خبر ہوتا ہے۔

''شامِ دوستاں آباد'' کے مصنف نے اپنی شخصی تحریروں کے حوالے سے 'خاکے' کا دعویٰ نہیں کیا اس کے باوجود یہ تحریریں خاکے کی فنی حدود سے تجاوز کرتی نظر نہیں آتیں۔ خاکہ نگار صرف ممدوح اصل پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں اس لیے غیر ضروری تفصیلات کا ان کے ہاں گزر نہیں۔ وہ اپنے خاکوں میں افسانے کی تیکنیک کو بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ اسلوب کی انفرادیت و دلکشی نے ان کے خاکوں کو مہکتے پھولوں کا روپ دیا ہے۔ وزیر آغا کے خاکوں کا سرمایہ اگرچہ بہت محدود لیکن گراں قدر ہے۔ اس لیے خاکہ نگاری کے ضمن میں انہیں نظر انداز کرنا ناانصافی کے مترادف ہوگا۔

❁❁❁❁

حمیدہ اختر رائے پوری

ڈاکٹر جمیل جالبی وہ جوہری ہیں جو ہیرے کی پہچان رکھتے ہیں۔ اردو ادب پر ان کے بے شمار احسانات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے حمیدہ اختر رائے پوری میں چھپے ادیب کو دریافت کیا۔ انہیں یادداشتیں لکھنے پر نہ صرف اکسایا بلکہ اتنا تعاقب کیا کہ وہ عمر پیری کے عذر کے باوجود لکھنے پر مجبور ہوگئیں۔ حمیدہ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کوئی شاہکار تخلیق کر رہی ہیں جو آنے والے دنوں میں ان کے ادبی مقام کا تعین کرے گا۔ وہ تو بس اپنی کہانی لکھ رہی تھیں جس کی زبان اتنی عمدہ، مصفّٰی اور چٹخارے دار، کہ مزہ برسوں نہ بھولے۔ ''ہمسفر'' کے بعد تو ان کا قلم رواں ہوگیا۔ پھر شخصی خاکوں کی کتاب ''نایاب ہیں ہم'' منظر عام پر آئی۔ اس میں وہی لوگ ہیں جو ان کے اپنے ہیں۔ ان کے خاکوں نے غیر معروف کرداروں کو امر کر دیا ہے بالکل اسی طرح جیسے اشرف صبوحی نے دلی کے ملن نائی، مٹھو بھٹیارا، مرزا چپاتی، گنجے نہاری والا، پیر جی کوے، میر ٹوٹرو، پرنانی اور نجانے کس کس کو ادب عالیہ کا حصہ بنا دیا ہے۔ اکا دکا غیر علمی شخصیات پر تو بہت سے ادیبوں نے خاکے لکھے ہیں لیکن کلی طور پر اشرف صبوحی کے بعد حمیدہ اختر ہی نظر آتی ہیں کہ جن کا قلم سبزۂ بیگانہ کے لیے وقف ہے۔ انہوں نے کل سات خاکے لکھے جن میں سے کم از کم چار تو غیر معروف کردار ہیں لیکن حمیدہ نے انہیں ضبطِ تحریر میں لا کر دوام بخشا ہے۔ ان میں سے ایک 'عنایت' ہے جو ذہین، موقع شناس اور ایثار و مروت کا پتلا اور ہر فن مولا ہے۔ یہ کردار دلچسپ اور عجیب و غریب ہے۔ شخصیت کے محاسن اپنی جگہ، حمیدہ کے حسنِ بیان نے بھی اسے سوانحی ادب کا نمایاں کردار بننے میں معاونت کی ہے۔

یہ درست ہے کہ مشہور شخصیت کا خاکہ ہی عام قاری کو متوجہ کرتا ہے کیونکہ قاری اس

kitaabiyat.blogspot.com

کے بارے میں جاننے کا خواہش مند ہوتا ہے اسے کسی عام اور غیر معروف شخص میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ عام آدمی پر لکھ کر قاری کو متوجہ کرانا ایک مشکل اور مشاقی کا عمل ہے۔ حمیدہ کا ایک خاکہ 'ابراہیم' پر ہے جو معاملہ فہم اور دانا و بینا ہے۔ ابراہیم خواص میں سے نہیں لیکن یہ اتنا عمدہ لکھا گیا ہے کہ قاری اسے پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا۔ ابراہیم کا کردار اتنا جاندار اور انداز بیان اتنا توانا ہے کہ پڑھنے والے پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور بہت دیر تک اس کے زیرِ اثر رہتا ہے۔

آمنہ ابراہیم بھی عوام الناس میں سے ہیں ان کا خاکہ بھی بھرپور ہے۔ قاری ناقابل یقین حد تک آمنہ کی خودداری اور اولعزمی کی داستان پڑھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوبا رہتا ہے وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر حمیدہ اسے ضبطِ تحریر میں نہ لاتیں تو یہ صنف ایک اچھے خاکے سے محروم رہتی۔

اُردو میں ماں کے حوالے سے چند ہی خاکے لکھے گئے ہیں۔ غالباً سب سے پہلے قدرت اللہ شہاب نے ''ماں جی'' لکھا۔ جسے شاہکار تصور کیا گیا۔ اکبر حمیدی کا ''ماں''، احمد عقیل روبی کا ''بی بی''، یونس جاوید کا ''چراغ آخر شب''، آغا ناصر کا ''غفاری بیگم''، حیدر قریشی کا ''مائے نی میں کنوں آکھاں''، ممتاز مفتی کا ''باندی'' اور حامد سراج کا ''میا'' بھی انفرادیت رکھتا ہے لیکن حمیدہ اختر کا خاکہ ''اماں'' ان سب سے الگ ہے۔ یہ ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو میں اتنے طویل خاکے کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔ حمیدہ کی اماں افسانوی کردار کی حامل ہیں جو قصے کہانیوں میں ملتی ہیں۔ وہ دور اندیش، عاقل اور نڈر خاتون تھیں۔ خاکے میں موجود واقعات کی روشنی میں اگر انہیں خاتونِ آہن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہم میں سے بے شمار لوگوں نے ایسی باکمال اور حیرت انگیز خاتون شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔ حمیدہ اس خاکے میں فن کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے ''اماں'' لکھ کر اردو خاکے کو توانا کردار عطا کیا ہے۔ اگر اسے حمیدہ کا شہکار قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

حمیدہ اختر کا خاکہ ''ہمارے مولوی صاحب'' اس لیے منفرد ہے کہ اس میں مولوی

عبدالحق نئے زاویے سے دریافت ہوئے ہیں۔ یہاں وہ گذشتہ تمام تذکروں سے مختلف ہیں۔ حمیدہ اختر کی شادی کے موقع پر مولوی صاحب نے جس لونڈھیارپن اور کھلنڈرے پن کا مظاہرہ کیا اس سے بھلا کون واقف ہے؟ مولوی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو کہیں اور نہیں ملتا۔ اسی طرح خاکے میں کئی مقامات پر مولوی صاحب کے اندر چھپا بیٹھا بچہ پوری حشر سامانیوں کے ساتھ باہر آتا ہے۔ بیڈمنٹن اور تاش کے کھیل میں مولوی صاحب اور اختر حسین رائے پوری تو بالکل چھوٹے بچوں کی طرح لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ کبھی بلا توڑا جاتا ہے۔ کبھی تاش کے پتے پھاڑ دیئے جاتے ہیں اور کبھی پچیسی کی بساط شکست و ریخت کا شکار ہوتی ہے۔ دونوں اپنی متانت اور مقام و مرتبے کو یکسر بھول جاتے ہیں۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ نمودار ہوتا ہے شاید اس لیے کہ دونوں ایک جیسے حالات کا شکار ہوئے تھے لیکن مولوی صاحب کا بچپنا تو اختر سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس خاکے سے مولوی صاحب کی نفسیات کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ قاری واقعات پڑھ کر مولوی صاحب کے مزاج سے خود بخود آشنا ہوتا چلا جاتا ہے اور مولوی صاحب کا باطن مکمل طور پر آشکار ہو جاتا ہے۔ اس خاکے میں مولوی صاحب کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی بشری کمزوریوں کو بھی احسن طریقے سے متعارف کرایا گیا ہے۔ میرے خیال میں مولوی عبدالحق کا اس سے زیادہ بھرپور، عمدہ اور جامع خاکہ کسی اور نے نہیں لکھا۔ اس خاکے کو بھی شاہکار قرار دینے میں کسی کو تامل نہیں ہونا چاہیے۔

''نیلی چھتری'' کو نیم خاکہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جس میں حمیدہ اختر کے والد ظفر عمر کا احوال ہے۔ نیلی چھتری ظفر عمر کے پہلے ناول کا نام ہے پھر اسی نام سے کوٹھی تعمیر کی گئی۔ عنوان پڑھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ اس مضمون میں نیلی چھتری میں بسنے والوں کے روز و شب کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ بھی ہے لیکن اس سے زیادہ صاحبِ خانہ یعنی ظفر عمر کی شخصیت کو سامنے لایا گیا ہے۔ ظفر عمر شفیق باپ، عالی ظرف، محنتی، ذہین، باصلاحیت اور ہمدرد و سیر چشم انسان کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ جن کی زندگی

kitaabiyat.blogspot.com

کے بیشتر معاملات میں اہلیہ کی حسن تدبیر کا عمل دخل ہے۔اب رہ گئی کمزوریوں کی بات، اس عہد میں جہاں اتنا لبرل باپ ہو کہ جو اپنی اور پرائی بیٹیوں کے علمی اور غیر علمی مشاغل کی حوصلہ افزائی کرتا ہو تو ایسے ماحول میں کسی بیٹی کو باپ میں برائی کیونکر نظر آئے گی۔صرف اسی بنیاد پر یکسر مسترد کر دینا زیادتی کے مترادف ہوگا۔ہوسکتا ہے کہ بعض ناقدین ''نیلی چھتری'' کو خاکہ قرار دینے سے اس لیے بھی کترائیں کہ تیکنیک کے لحاظ سے یہ مروجہ اصولوں کے مطابق نہیں۔پہلے چار پانچ صفحات میں اپنے والد سے مکالمے کی شکل میں ان کی شخصیت کو کھنگالا گیا ہے پھر تقریباً سوانحی انداز اختیار کیا جس میں شادی کی تفصیلات اور بعض متعلقین کے اذکار بھی ہیں لیکن دیکھا جائے تو اس مضمون میں ظفر عمر اپنی تمام تر صلاحیتوں اور سرگرمیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں جن سے ان کی شخصیت کے نقوش ابھرتے جاتے ہیں۔پھر ہم ظفر عمر کو مکمل سراپے کے ساتھ اپنی سامنے پاتے ہیں۔بہرحال یہ مضمون نیم خاکے کے شکل میں انفرادی شان لیے ہوئے ہے۔البتہ ایک قباحت ہے کہ نوے فیصد مندرجات دوسرے خاکوں کے ذیل میں آچکے ہیں۔اگر کسی نے وہ خاکے اس سے قبل پڑھ لیے تو وہ ''نیلی چھتری'' سے لطف اندوز نہیں ہوگا بلکہ تکرار کھلے گی۔

''بیادِ اختر'' اختر حسین رائے پوری پر یک رخا خاکہ ہے جو ان کی خودنوشت ''گردِ راہ'' کے تیسرے ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔اس میں انہوں نے اختر کے بعض غیر مذکور پہلوؤں کا تحسین آمیز ذکر کیا ہے۔یہ طوالت سے گریز اور جامعیت جیسی خوبیاں سمیٹے ہوئے ہے۔زیادہ بہتر یہ ہوتا کہ حمیدہ کی خودنوشت ''ہمسفر'' اور ''نایاب ہیں ہم'' میں اختر کے حوالے سے مندرجات لے کر ایک خاکہ ترتیب دیا جاتا جس میں ان کے احسن اور کمزور دونوں پہلو سامنے آتے کیونکہ دونوں کتب میں اختر کی کمزوریوں مثلاً نازک مزاجی، ہٹ اور سر پھرے پن کا ذکر ہے اگر وہ سب کچھ یکجا ہو جاتا تو اختر کا بہت عمدہ خاکہ ترتیب پاتا۔شاید مرتبین اور مصنفہ نے تکرار سے بچنے کے لیے ایسا نہ کیا ہو۔تاہم اس تاثراتی خاکے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حمیدہ اختر اپنے خاکوں میں داستان گو کے روپ میں ابھرتی ہیں۔کہیں کہیں وہ اس کا اعتراف بھی کرتی ہیں:

''آپ کو شاید کہانی سننے کا چسکا سا لگ گیا ہے، تو مجھے آپ کو کہانی سنانے میں درحقیقت مزا آنے لگا ہے۔'' (ص:۹۹)

''آمنہ ابراہیم'' میں داستانی انداز بیان کو برملا محسوس کیا جاسکتا ہے اسی طرح ''عنایت'' میں بھی کہانی سنانے کا انداز نمایاں ہے:

''عنایت کی تو موج آگئی۔یہاں اور بہت سے بچے پڑھنے آتے ان سے دوستی ہوگئی۔کچھ پڑھا، کچھ کھیل کود کی مولوی صاحب کا ہر کام دل لگا کر کرتے۔شام ہوتے ہی ہاشم ان کو لے کر کلب آجاتے۔ٹینس کورٹ کے پاس کھڑا کر کے کہتے، جو گیند باہر لکیر کے آئے اسے پکڑ کر اندر پھینک دینا۔بھئی یہ تو بہت دلچسپ مشغلہ تھا اور یہ اتنے بڑے بڑے لوگ بلا ہاتھ میں لیے اچھل کود کرتے ہوئے ان کو عجیب لگتے۔'' (ص:۲۰۶)

اور ''ابراہیم'' کا خاکہ بھی اپنے داستانی انداز بیان کے سبب قاری کو جکڑے رکھتا ہے۔حمیدہ کا یہ اسلوب ان کے تقریباً تمام خاکوں میں نظر آتا ہے۔

حمیدہ اختر سلیقہ سے بات کرنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔انہوں نے اپنے خاندان کے کارناموں کا ذکر کرنا تھا تو اس کی گنجائش عنایت کے خاکے میں نکالی اور تین صفحات میں سب کچھ ہنرمندی سے مذکور کر دیا۔ہوسکتا ہے کہ اس مقام پر بھی بعض ناقدین کی جبینوں پر شکنیں پڑیں اور وہ اسے غیر ضروری مواد قرار دے کر خاکہ ماننے سے انکاری ہو جائیں لیکن حمیدہ کی ہنرمندی کی داد ضرور دیں گے۔

حمیدہ کے اسلوب میں ڈرامائی شان بھی پائی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ تجسس بھی قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔مس نور جہاں کے قصہ میں تو یہ عروج پر ہے حمیدہ

kitaabiyat.blogspot.com

کے والد ناول نگار تھے۔ شاید اسی سبب تجسس نگاری کا وصف ان کے جینز میں شامل ہو گیا ہے ۔اس کے علاوہ جذبات نگاری کے نمونے بھی ان کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔

حمیدہ کے اسلوب بیان کی ایک خوبی گفتگو کا سا انداز ہے۔ بہت سے مقامات پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جمیل جالبی یا مشفق خواجہ ان کے سامنے بیٹھے ہیں اور وہ ان سے ہمکلام ہیں:

''جمیل بھیا! ایک جو بہت دلچسپ گورکھپور کی دَین تھی، اس کا ذکر درمیان سے صاف نکل گیا۔ شکر کہ اس وقت یاد آ گیا۔''

(ص:۱۳۴)

''اے حد ہو گئی جمیل بھائی! کہ خلیل والا قصہ تو نامکمل ہی رہ گیا۔ ذرا تیزی سے آگے کو بڑھ رہی تھی، شکر ہے یاد آ گیا۔''

(ص:۱۳۸)

حمیدہ اختر کے ہاں چٹخارے دار زبان پڑھنے کو ملتی ہے۔ قاری کو ارائے بھرنا، اٹ پٹا سا محسوس کرنا، نٹھلے دوست، ٹھناٹھنی، ڈپٹیاں پڑنا، اٹرم شٹرم اور نجانے کتنے ٹکسالی روزمرے اور محاورے پڑھنے کو ملتے ہیں جو دورِ حاضر کے قاری کو زبان آشنائی کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ لہجے کی عمدگی نے زبان کی مٹھاس میں اضافہ کیا ہے۔

حمیدہ اختر اپنے خاکوں کا آغاز دلکش پیرائے میں کرتی ہیں۔ عموماً بے تکلفانہ گفتگو کا سا انداز قاری کو ابتدا ہی میں اسیر کر لیتا ہے۔ ''اماں'' کا ابتدائیہ پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم خط پڑھ رہے ہیں جبکہ ''ہمارے مولوی صاحب'' اور دیگر خاکوں میں بے ساختہ پن کا عنصر نمایاں ہے۔

حمیدہ اختر نے کمال کا حافظہ پایا ہے۔ پرانی جگہوں اور مناظر کی ذرا ذرا سی تفصیل انہیں یاد ہے۔ وہ جزئیات کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ عبارت کہیں بھی غیر ضروری محسوس نہیں ہوتی۔ کسی بھی لمحہ قاری کی دلچسپی اکتاہٹ میں نہیں بدلتی۔ وہ طائرانہ نظر میں ہی سارے

منظر کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ رخصتی کے بعد پہلی بار گھر میں داخل ہوئیں تو ڈرائنگ روم، ہال کمرہ، مولوی صاحب کا دفتر، جہاں جہاں سے گزریں اس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ان کی آنکھوں نے جکڑ لیا:

''اس کے ساتھ جو کمرہ تھا اس کو تھوڑا سا جھنکایا کہ یہ ان کا اپنا دفتر ہے۔ ہر طرف کتابوں کی اونچی اونچی الماریاں، ایک طرف ان کا لکھنے کا ڈیسک، کچھ فاصلے سے ایک آرام دہ کرسی، جس کے قریب تھال میں پیچوان رکھا ہوا۔ ایک طرف چھوٹی سی میز پر ایک سماوار، چائے کی پتی کے ڈبے اور چند پیالیاں اور ایک چائے دان پڑا تھا۔ یہاں جو کتابوں کی الماریاں تھیں ان کی کتابیں بہت بوسیدہ سی لگیں۔'' (ص:۲۵)

ذرا سا جھانکنے میں ہی سب کچھ ان کی نظروں میں سما گیا یہاں تک کہ الماریوں میں بند بوسیدہ کتابیں بھی نظروں سے اوجھل نہ ہوئیں۔

جزئیات نگاری کی خوبی حمیدہ کے تقریباً ہر خاکے میں نظر آتی ہے قیامِ پاکستان کے بعد اختر حسین رائے پوری، ابراہیم کو اپنے دفتر لے جاتے ہیں، جس کے حالت یہ تھی:

''ایک پرانی بیرک — جس کا پلاسٹر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا، کھپریل کی چھتیں، فرش اِدھر سے اُدھر جو ٹوٹ کر اکھڑ گیا تھا، موٹے کھردرے سیمنٹ سے اونچا نیچا مرمت کیا ہوا۔ دیواروں اور چھت کی سفیدی کی پپڑیاں جگہ جگہ سے جھڑی ہوئی۔ پنکھے پر انچوں دھول جمی ہوئی۔ بیچ میں ایک میز جس کا چوتھا پایہ غائب ہو گیا تھا، اس کی جگہ کئی بلاک رکھ دیئے گئے۔ ایک کرسی جس کا ہتھا نکلا ہوا، سامنے کونے میں دیوار سے ٹکا کھڑا تھا۔ ایک چارپٹروں کا ریک جس پر کبھی وارنش کی ہی

kitaabiyat.blogspot.com

نہیں گئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک لمبی بینچ بھی تھی۔ ساتھ
ہی اس طرح کے تین اور کمرے، تو یہ تھا محکمۂ تعلیم کا دفتر۔''

(ص:۲۴۶)

اتنی جزئیات وہی بیان کرسکتا ہے جس نے باریک بینی سے دیکھا ہو۔ عبارت پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ حمیدہ کا اپنا دفتر تھا جس کی ذرا ذرا سی تفصیل انہیں ابھی تک یاد ہے۔

حمیدہ اختر ممدوح کا نقشہ اتنی عمدگی سے کھینچتی ہیں کہ شخصیت پورے سراپے کے ساتھ ہمارے سامنے چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے ان کا خاکہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ممدوح کے زمانے میں ہیں۔ اس کے تمام افعال ہمارے سامنے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ ان کے خاکوں کی کامیابی کا راز اسی ہنر میں مضمر ہے۔

سراپا نگاری خاکے کا جزو ہے۔ بعض لوگ اپنے اندازِ نگارش کے سبب سراپا نگاری میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ حمیدہ اختر کے ہاں اگرچہ اچنبھا پن نہیں لیکن سادہ اسلوب قاری کو مخمصے میں ڈالے بغیر شخصیت کی صحیح تصویر کشی کر دیتا ہے۔ آمنہ ابراہیم کا حلیہ ملاحظہ ہو:

''بے حد سرخ و سفید رنگ، چہرہ کی جلد پر جیسے کچھ ابرق کی سی
چمک، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، پتلی کمان جیسی
بھنویں، ستواں ناک، گلابی ہونٹ، دانت موتی کی لڑی کی
طرح چمکتے ہوئے، قد خوب ہی لمبا، جسم عین مناسب، ایک
عجیب قسم کا تناؤ، گردن پتلی لمبی، بچی کی پیٹھ پر رکھا ہوا ہاتھ جس
کی لمبی انگلیاں اور خالی کلائی بغیر کسی چوڑی کے، لامحالہ دوسرا
ہاتھ جو لڑکے کی انگلی پکڑے تھا، اس پر بھی نظر پڑی۔ سڈول
کلائی بغیر چوڑی کے دیکھ کر ہم دونوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید یہ
بیوہ ہیں۔'' (ص:۱۸۷۔۱۸۶)

حمیدہ اختر اپنے دل میں قومی درد رکھتی ہیں اس کا ثبوت ہمیں ''اماں'' میں ملتا ہے

جہاں وہ وطن عزیز کی حالت زار پر شدید کرب کا اظہار کرتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں وہ اپنی روایت سے ہٹ گئی ہیں بلکہ بری طرح بہکی ہیں۔ وہ یہ بھول گئیں کہ وہ اپنی والدہ کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ تقریباً پانچ صفحات ملکی صورتحال پر وقف کر دیئے جو بے جوڑ محسوس ہوتے ہیں۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ناقدین فن اس پیوندکاری پر ''اماں'' کو خاکہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں لیکن ۸۶ صفحات میں پانچ صفحات کا جوڑ اس لیے گوارا ہے کہ باقی ۸۱ صفحوں میں ''اماں'' کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

حمیدہ اختر کی تحریر میں کہیں کہیں الجھاؤ بھی ہے جو قاری کی فہم کا امتحان لیتا ہے ایک اقتباس دیکھیے:

''لیکن آج جب میں آپ کو یہ کہانی سنانے بیٹھی ہوں تو خود
حیران سی ہو گئی ہوں کہ انسان کا دماغ، کوئی جادوگر ہے جس
میں کبھی کبھار کا سنا جملہ، کوئی اکا دکا حرف، کوئی ناگوار بات سن
کر چہرے کا اتار چڑھاؤ، کسی کو غلط یا نازیبا بات کرتے دیکھ کر
بجائے ناراضگی کے الفاظ منہ سے نکلنے کے، چند تیز تیز قدم لے
کر وہاں سے آگے بڑھ جانا۔ بڑے سے بڑے صدمے کو
ایک جھرجھری سے لے کر جیسے کچھ اندر کو پی لینا، لفظ ڈر سے
نفرت اور کسی بات پر آنسو بہانا ان کی برداشت سے باہر اور
جھوٹ ان کے سامنے بولنے کا سوال ہی نہ تھا۔'' (ص:۱۰۲)

حمیدہ اختر کی عبارت میں پیراگرافوں کی مزید تقسیم کی گنجائش باقی ہے بیشتر مقامات پر مختلف باتیں تسلسل کے ساتھ ہیں جو باہم مل کر تفہیم میں دشواری کا سبب بنتی ہیں۔

حمیدہ نے ایک سے زیادہ مقام پر لکھا ہے کہ ان کے والد نے اپنے پہلے ناول ''نیلی چھتری'' کی آمدنی سے کوٹھی بنوائی۔ اس بات کی صداقت کے حوالے سے شک کی لہریں ابھرتی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ کتاب لاکھوں کی تعداد میں چھپی ہو۔ زمانہ کتنا ہی سستا کیوں

kitaabiyat.blogspot.com

نہ ہو، کم از کم برصغیر میں کتاب یا کتابوں کی آمدنی سے وسیع و عریض کوٹھی بنوانا ناقابلِ یقین بات ہے۔ آج بھی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کی رقم سے کوٹھی تو درکنار، مناسب مکان بنوانا ممکنات میں سے نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حمیدہ کے والد نے اپنے تمام ناولوں کی فروخت کی رقم سے کوٹھی بنوائی تھی تب بھی اتنی رقم نہیں بنتی۔ یہاں حمیدہ جوشِ محبت میں چوک کر غیر حقیقی بات کہہ گئی ہیں۔

حمیدہ اختر کی تصنیف ''نایاب ہیں ہم'' ایسے عجائب خانہ کی مانند ہے کہ جس میں نادر و نایاب تصاویر آویزاں ہیں یا عجیب و غریب کردار کی حامل شخصیات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے جو دورِ حاضر میں واقعی نایاب ہیں۔ دورانِ آگہی ناظر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اسے آس پاس کی خبر نہیں رہتی۔

اگرچہ حمیدہ اختر کی نظر محاسن پر رہتی ہے لیکن وہ بشری کمزوریوں کو اس مہارت سے سامنے لاتی ہیں کہ شخصیت مجروح نہیں ہوتی اور احسن پہلو پر آنچ نہیں آتی۔ مولوی عبدالحق اور عنایت کے خاکے اس کا بیّن ثبوت ہیں۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حمیدہ اختر کی قلمی تصویریں واضح اور متحرک ہیں۔ ان کے ہاں آمد ہے آورد نہیں۔ وہ واقعات سے سیرت کشید کرتی ہیں۔ ان کے خاکوں میں اگرچہ عقیدت و محبت کا رنگ نمایاں ہے اور روشن پہلو پر زور دیا گیا ہے لیکن بشری کمزوریوں سے پہلو تہی نہیں کی گئی۔ ان کے بیان میں وہ اپنائیت و ہمدردی بھی موجود ہے جو خاکے کا لازمہ ہے۔ ان کے شگفتہ اسلوب نے خاکوں کو رعنائی عطا کی ہے جو انہی کا خاصہ ہے۔

❁❁❁❁

ڈاکٹر اسلم فرخی

ڈاکٹر اسلم فرخی تحقیق، تنقید، شاعری اور خاکہ نویسی کا مستند حوالہ ہیں۔ وہ دبستانِ کراچی کے نمائندہ اور صاحب اسلوب انشاء پرداز ہیں۔ انہوں نے اپنی تین تصانیف ''گلدستہ احباب''، ''آنگن میں ستارے'' اور ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' میں ۴۳ شخصیات کے خاکے قلم بند کیے ہیں جو اس صنف میں اہم اضافہ ہیں۔

''گلدستۂ احباب'' ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس کا نقشِ اوّل، ''چمنے کہ تا قیامت.....'' کے عنوان سے ہے۔ جو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا نہایت عمدہ اور جاندار خاکہ ہے۔ فاضل خاکہ نگار کا ممدوح سے گہرا تعلق رہا ہے۔ جس کے باعث وہ شخصیت کا ہر زاویہ سامنے لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ قاری شخصیت کے احسن اور توانا پہلوؤں سے شناسا ہوتا ہے۔ رہی کمزوریوں کی بات، تو خاکے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایسے ولی اللہ ہیں کہ جن میں خامیاں نہیں یا پھر عوام الناس کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

''بنامِ شاہدِ نازک خیالاں'' شاہد احمد دہلوی پر لکھا گیا اعلیٰ معیار کا خاکہ ہے۔ جس میں خاکہ نگار اپنے ممدوح کے مزاج، عادات، رویوں اور انداز کو زیرِ بحث لانے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں نیز اپنے وجود کا بھی بھرپور احساس دلاتے ہیں۔

علم و فضل، صبر و تحمل، خوش بیانی، وضعداری، چٹکلے بازی، مہمان نوازی، بے غرضی، فراخ ظرفی، نیک نفسی، ہمدردی اور حوصلہ مندی کے خطوط سے تشکیل پانے والی تصویر اشرف صبوحی کی ہے۔ جس کا عنوان ''بھائی ولی'' ہے۔ اس تحریر میں ممدوح کے فن کو بھی متعارف کرایا گیا ہے لیکن شخصیت سے متعلق مواد نے اسے عمدہ اور جاندار خاکے کے درجے تک

kitaabiyat.blogspot.com

جا پہنچایا ہے۔

''ثناء خوانِ محبت'' تابش دہلوی کا خاکہ ہے جس سے ان کی قرینہ شعاری، دین داری، شائستگی، سعادت مندی، صحتِ زبان کا خیال، احباب کی مدد اور مشاعروں سے عشق سمیت دیگر معاملات کا پتہ چلتا ہے۔ معیار کے لحاظ سے یہ خاکہ بھی معقول تصور ہوگا۔

''شان الحق حقی'' تقریباتی مضمون ہے۔ چند عادتوں کے بیان سے اس میں خاکے کا رنگ ضرور ہے مگر ڈاکٹر اسلم فرخی مکمل تصویر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ شاید خاکہ لکھنا پیشِ نظر نہ تھا لیکن خاکے سے مشابہت کے سبب مجموعے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

نشریات کی دنیا کے امام زیڈ اے بخاری کا خاکہ ''ذوالفقار علی بخاری'' کے نام سے لکھا گیا ہے۔ خاکہ نگار نے اپنے ممدوح میں شگفتہ مزاجی، جملے بازی، مستعدی، سخت گیری، غصے میں دل سوزی، وضع داری، زبان کے معاملے میں حساسیت، اعلیٰ تنقیدی بصیرت، اصلاح میں شفقت، کسی پر احسان نہ جتانا، جزئیات پر ماہرانہ نگاہ، رعب و دبدبہ، معمولی بات پر بگڑ کر جلد ٹھیک ہونا، ملامت میں پیار اور خلوص کو دریافت کیا ہے۔ اس خاکے میں بخاری کی شاعری، علمی تقاریب میں کردار اور پیشہ وارانہ امور میں مہارت کا احوال بھی ملتا ہے۔ خاکہ نگار نے جن جن زاویوں سے اپنے ممدوح کو دیکھا ان تمام کی تصویر کشی کی ہے جو انتہائی واضح، شفاف اور فنی مہارت کا شاہکار ہے۔ یہ خاکہ اس لحاظ سے بھی کامیاب ہے کہ اثر انگیزی کے وصف کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

''مولانا ارشد تھانوی'' مختصر مگر جامع خاکہ ہے۔ شخصیت کے ہر رنگ ڈھنگ سے واقفیت ہوتی ہے۔ حسبِ معمول دلچسپی کا دامن نہیں چھوٹتا۔

''ٹوٹی ہوئی اکائی'' سلیم احمد کا مؤثر خاکہ ہے جس میں محبت بھرے انداز میں سلیم احمد کی ہر ادا کا ذکر ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک طویل خاکہ ابوالفضل صدیقی نے لکھا تھا لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی کا ''نقشِ جمیل'' معیار کے لحاظ سے اس سے بہت آگے ثابت ہوا۔ شاید ہی کوئی گوشہ ایسا

ہو جو بے نقاب ہونے سے رہ گیا ہو۔ اسلم فرخی کا یہ خاکہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ افسر اور ماتحت کی حیثیت سے جو اوصاف منکشف ہوئے ان کی جزئیات دوسرے حصہ میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ خاکہ اس وقت لکھا گیا جب ڈاکٹر جمیل جالبی وائس چانسلر اور ڈاکٹر اسلم فرخی ان کے ماتحت رجسٹرار تھے۔ ایسی صورت میں خاکہ کے منصفانہ اور بے لاگ ہونے پر شبہ کی خوب گنجائش تھی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پردے میں بھی بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ اس خاکے کی رو سے ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے ممدوح میں حلم و برداشت، بچوں میں کم دلچسپی، لباس کے معاملے میں بے پروائی، کتب خانے میں نفاست و خوش سلیقگی، خلق و مہمان نوازی، فیاضی و دریا دلی، سیر چشمی، جاں فشانی، نرم گوئی، مردم شناسی، انا و نخوت سے دوری، خوش خطی، قلموں کا غیر معمولی شوق، بزرگوں کی خدمت، نام نمود سے چڑ، قلتِ طعام، کام میں غیر معمولی لگن، فیصلے میں جلد بازی سے اجتناب، کسی کے دباؤ کو قبول نہ کرنا، استقامت، جمہوری مزاج، ذہانت، سلام میں پہل کی عادت، دفتری امور میں ہوش مندی و کفایت شعاری، مثلوں میں تقلیلِ الفاظ کا ہنر اور زندگی کے ہر شعبے میں تیز رفتاری جیسی خوبیوں کا سراغ لگایا ہے۔

''یکسر وہ استخوان .....'' مجتبیٰ حسین کا شخصیت نامہ ہے جس میں کہیں مضمون کا رنگ ہے اور کہیں خاکے کا انداز۔ اس تحریر میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے مجتبیٰ حسین کا علمی و ادبی احوال سپردِ قلم کرنے کے بعد شخصی زاویوں کا کھوج لگایا ہے۔ وہ اپنے ممدوح میں شفقت، اخلاص، پابندیٔ وقت، خودداری، سادہ مزاجی، محفل آرائی اور گھبراہٹ کے پہلو دریافت کر پائے ہیں۔

''اے سارباں آہستہ راں'' اعلیٰ درجے کا خاکہ ہے اس میں عزیز حامد مدنی کے ایک ایک نقش کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ دورانِ مطالعہ قاری خود کو ممدوح کے قریب تر محسوس کرتا ہے۔

''گردشِ انجم'' آغاز میں ہی تعزیت نامے کی منزل کو پھلانگ کر مؤثر و مضبط خاکے کا روپ دھار لیتا ہے جس میں انجم اعظمی کی ذات کے دونوں رخ پیش کیے گئے ہیں۔

kitaabiyat.blogspot.com

کمزوریوں کی جانب اشاروں نے خاکے کے رنگ کو چوکھا کیا ہے۔

''کرار نوری کی یاد میں'' مختصر ترین مگر جامع خاکہ ہے۔ عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے کہیں سقم یا جھول محسوس نہیں ہوتا۔

''گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو.....'' سری نگر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر مشیر الحق کا شخصیہ ہے جس میں خاکے کے تقاضے پوری کرنے کی بھرپور سعی کی گئی ہے۔ یہ دوسروں کے مقابلے میں ذرا ہلکا ہے اس کی وجہ شاید بعدِ مکانی ہے۔ ممدوح پاکستان آئے یا خاکہ نگار ہندوستان گئے تو ملاقاتیں ہوئیں۔ مہمان و میزبان کا تکلفانہ برتاؤ شخصیت کی پرتیں کھولنے میں مدد نہیں دیتا۔ روزمرہ کی ملاقاتیں ہوتیں تو شخصی پہلوؤں پر کڑی نظر ہوتی۔ عادتوں، طور طریقوں اور رویوں سے آشنائی ہوتی۔ مہمان و میزبان کی حیثیت سے چند ملاقاتوں میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو قرب تعلق سے ہوتی ہے۔ اس شخصیت نامے میں ممدوح کی علمی وجاہت اور فنی پہلوؤں پر بھی خاصا اظہارِ خیال ہے اس کے باوجود ڈاکٹر اسلم فرخی قاری کے ذہن پر ممدوح کا نقش بٹھانے میں کامیاب رہے ہیں۔

مسرت علی سرور کا خاکہ ''سرورِ عنبر و دست'' بھی عمدگی، کشش اور جاذبیت کی خوبیاں رکھتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے بچپن کے دوست ضمیر الدین احمد کی وفات پر مرحوم کے نام یادوں سے بھرپور خط تحریر کیا جسے ''ضمیر منیر دوست'' کے عنوان سے خاکوں کے مجموعے میں شامل کیا گیا۔ اس تحریر میں کرداروں کے ہجوم میں مرکزی کردار خاصا پیچھے نظر آتا ہے جب کہ مصنف خود بھی خوب جلوہ گر ہیں۔ ممدوح کے حوالے سے اضطرابیت، شرارت، اکڑ بازی، ضد اور لڑاکا ہونے کے خدوخال ابھرے ہیں۔ خط میں خاکے کی جھلک تو ہے لیکن مکمل خاکہ قرار پانے سے قاصر ہے۔

''میں فرشتہ تو نہیں'' غلام ربانی تاباں کا بہت اچھا خاکہ ہے۔ وضو سے عدمِ واقفیت اور شراب نوشی جیسی کمزوریوں کا بھی احسن انداز میں تذکرہ ہے کہ نفرت کا

باعث نہیں بنتیں بلکہ محاسن کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ فی الحقیقت خاکہ نگار تاباں شناسی میں کامیاب رہے ہیں۔

''آنگن میں ستارے'' ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں سترہ خاکے ہیں مجموعے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصہ میں گیارہ مرحومین کے خاکے ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں چھ زندہ شخصیات سے متعلق تحریریں ہیں۔ سب سے پہلا خاکہ پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر کا ہے۔ خاکہ نگار نے واحدانیت پر پختہ ایمان، عشقِ رسول ﷺ اصول پسندی، قناعت پسندی، سفارش دشمنی، صاف گوئی، آزادہ روی، دوست نوازی، شطرنج سے دلچسپی، کتابیں مستعار دینے میں فیاضی، نظم و نسق کی پابندی، سادگی، حرف شکایت سے ناآشنائی، انانیت، مضبوط یادداشت، خان صاحبیت، پسند و ناپسند میں شدت، کھانے پینے سے شغف، کھانا پکوانے میں مہارت اور مالی امور سے ناواقفیت کے رنگوں سے اپنے ممدوح کی تصویر بنائی ہے جو قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔ فنکارانہ مہارت کے سبب یہ خاکہ بلاشبہ اعلیٰ درجے کا ہے۔

''مالک رام'' بھی ایسا خاکہ ہے جس میں ممدوح کی تصویر کشی کامیابی سے کی گئی ہے۔ قاری زیرِ بحث شخصیت سے بہت حد تک آشنا ہوتا ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین کا خاکہ ''قصۂ ممتاز'' کے نام سے لکھا گیا ہے دورانِ مطالعہ سنجیدہ و متین ممتاز حسین سے قربت کا احساس ہوتا ہے ان کی بشری کمزوریوں، وہم، گھبراہٹ، بھلکڑ پن اور جوشِ کلام میں دوسروں کی نہ سننا، کے بیان نے خاکے کو یک رخا ہونے سے بچا لیا ہے بلکہ زیادہ معتبر بنا دیا ہے۔

شاعری، شاعر نوازی، ملنساری، نرم خوئی، جامہ زیبی، حوصلہ مندی، انسان دوستی، خلق اور حلم کے رنگوں سے تشکیل پانے والی ڈاکٹر یاور عباس کی من موہنی شخصیت کو ''عجیب تھیں چارہ گر کی باتیں'' میں پیش کیا گیا ہے۔ اس خاکے میں مشاعروں کی مختصر روداد کے ساتھ ساتھ بہت سے کرداروں کے مختصر تذکرے بھی ہیں۔

kitaabiyat.blogspot.com

ڈاکٹر اسلم فرخی نے نورالحسن جعفری کا شاہکار خاکہ ''نور علیٰ نور'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں نور کی ذات کو اچھی طرح کھنگالا گیا ہے۔ ان کے مزاج، کیفیات اور چھوٹی چھوٹی عادات کو بھی لفظوں کی زبان عطا کی گئی ہے۔ شخصیت کے کمزور پہلوؤں کو ہمدردانہ انداز میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے خاکے کو دل کشی عطا کی گئی ہے۔ شاید ہی کوئی پہلو ہو جو لکھنے سے رہ گیا ہو۔ یہ خاکہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے بیشتر خاکوں سے قطعی مختلف ہے۔

''ہمارے ساتھ کے سب لوگ'' انور عنایت اللہ کا مختصر مگر پر اثر خاکہ ہے۔ فاضل خاکہ نگار نے اپنے ممدوح میں نرمی و لطافت، معصومیت، ناشائستہ گفتگو اور بحث و تکرار سے اجتناب، خوش مزاجی، بے غرضی و بے ریائی، کام میں انہماک و مستعدی، بدگوئی و تجسس سے گریز، کلاسیکی موسیقی کا گہرا شعور، مزاح اور جلد بازی کو بازیافت کیا ہے۔

''عاقبت محمود باد'' میں ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی کی شخصیت کا احاطہ کیا گیا ہے جس میں ایک ایک وصف اور عادت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ مکمل، بھرپور اور معیاری خاکہ ہے۔

''ثناء خوانِ حق'' میں بیشتر مواد مولوی ثناء الحق صدیقی کے علمی مقام و مرتبے اور خدمات سے متعلق ہے۔ تاہم ساتھ ساتھ ذات کے گوشوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

''رقص کرنے والا بگولہ'' میں حمید نسیم کی پیشہ وارانہ امور میں مہارت اور ذمہ داریوں کا احوال ملتا ہے اس خاکے سے حمید نسیم کے جو اوصاف مترشح ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔ شفقت و نرمی، افسرانہ برتاؤ سے دوری، حوصلہ مندی، کسی کا برا نہ چاہنا، بے قراریت، قناعت، عفو و درگزر اور ہر ایک کی مدد میں پیش پیش۔

''حکیم چٹکلے باز'' نہایت دلچسپ خاکہ ہے جس میں حکیم مانی کی حذاقت اور طبّی مہارت کے حوالے سے خوب تفصیل فراہم کی گئی ہے۔ اس خاکے میں حکیم مانی کے اللہ پر غیر متزلزل یقین، عشقِ رسول ﷺ، عبادت گزاری، قناعت پسندی، انسانی ہمدردی، اصول پسندی، درویشی، شائستگی، وضعداری، دیانت داری، لباس اور رہن سہن میں سادگی، قیافہ شناسی، اعلیٰ شعری ذوق، علم جفر میں مہارت کے علاوہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی کے نقوش ابھرے ہیں۔

خوش مزاجی، زندہ دلی، عالی حوصلگی، دوست نوازی، صاف دلی، جاں نثاری و وفاداری، تیز مزاجی، سحر انگیزی، نفرت و محبت میں تعمق، مخالفوں کے لیے شمشیر برہنہ، ادبی خبر نامہ، طول کلامی کا لپکا، ان تمام خطوط سے تشکیل پانے والی تصویر شیخ اکرام احمد کی ہے جو ''پتلے اکرام'' کے عنوان سے نذرِ قارئین کی گئی ہے۔ دوران مطالعہ قاری خود کو زیرِ نظر شخصیت سے الگ نہیں کر پاتا۔

''شریف کنجاہی'' تقریباتی مضمون ہے جس میں خاکے کی ہلکی سی لہر ہے۔ مصنف نے خود اسے ''شخصیت کا جائزہ'' اور ''تاثراتی مضمون'' سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ تحریر خاکے کے دائرے سے باہر ہے۔

''کس ادا کے ساتھ'' ادا جعفری کا خاکہ ہے جس میں شعوری کوشش جھلکتی ہے۔ آمد کی بجائے آورد، بے ساختگی کی بجائے ساختگی کا گمان ہوتا ہے۔ اسی لیے روایتی چاشنی سے محروم ہے۔ مختلف ہوتا تو شاید جاذبیت رکھتا۔ اس کی تمہید بھی خاکہ نگار کی روایت کے قطعی برعکس کافی طویل ہے۔

''جلا ہوا دیا'' فنکارانہ مہارت سے تحریر کیا گیا شخصیت نامہ ہے کہ خاکے کا گمان ہوتا ہے۔ جس میں پیرزادہ قاسم کے شخصی گوشوں مسلک عارفانہ کی پیروکاری، خوش بیانی، فعالیت اور مقبولیت کو ان کی یونیورسٹی کی ذمہ داریوں اور شاعری سے اخذ کیا گیا ہے۔

''دستک سے دل تک'' واصل عثمانی کا عمدگی سے تحریر کیا گیا خاکہ ہے جس میں شخصیت کے احسن اور قبیح دونوں پہلوؤں کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس عمل نے خاکے کو توانائی بخشی ہے۔

''درویش خدا مست'' محمد احمد سبزواری کا مختصر مگر موثر خاکہ ہے جس میں ممدوح کے فن اور شخصیت سے خوب آشنائی ہوتی ہے۔

''کچھ احوال اپنے ضمیر کا'' میں معروف صحافی ضمیر نیازی پورے رنگ و آہنگ

kitaabiyat.blogspot.com

کے ساتھ ہمارے درمیان محسوس ہوتے ہیں۔ خاکہ نگار نے ممدوح کو ایسے لیٹواں پیڑ سے تشبیہہ دی ہے جو دتی میں ایک ولی اللہ شیخ شمس الدین اوتاد اللہؒ کے مزار پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ اس استعارہ کی تکرار سے خاکے کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ خاکے میں ضمیر کی علمی وصحافتی خدمات کا تذکرہ بھی تفصیل سے ہے۔ حسن تحریر نے اسے عمدہ خاکوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکوں کا تیسرا مجموعہ ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' کے نام سے ہے جس میں نو شخصیات کے خاکے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی علم وادب کی نمائندہ یا مشہور ومعروف شخصیت نہیں بلکہ فاضل خاکہ نگار کی نجی زندگی کے قریب ترین لوگ ہیں۔ پہلا خاکہ ''تلاشِ وفا'' اسلم فرخی کے پھوپھی زاد بھائی ابوالقاسم دفا فرخ آبادی کا ہے۔ جس میں وفا کی سادہ لوحی، تلون مزاجی، شاہ خرچی، بیٹیوں سے غیر معمولی محبت، فیصلوں میں اٹل، فکر شعر میں استغراق اور جگر مرادآبادی سے خصوصی تعلق کے پہلو سامنے آئے ہیں۔

نظر انداز لوگوں کے رویوں کو لفظوں میں منتقل کرنے کی جس روایت کا آغاز مولوی عبدالحق نے ''نام دیو مالی'' سے کیا تھا اسے کچھ اور لوگوں نے آگے بڑھایا ان میں ڈاکٹر اسلم فرخی بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے معاشرے کے ایک مسترد کردار ''شوکت'' کو ادب کے کینوس پر ''لذت آشنائے تلخیٔ دوراں'' کے عنوان سے پینٹ کر کے دوام بخشا ہے۔ اس شاندار خاکے میں مولوی صاحب، منومیاں، مقصود چائے والا، تلن، تلن کی بیوی، حکیم امین، واجد خاں، ماجد خاں، فقیر محمد خاں اور بھاوج جیسے ضمنی کرداروں کا ایک نگار خانہ آباد ہے۔ ہر کردار اپنے مقام پر طلوع ہوتا ہے۔ کوئی جھلک دکھا کر چلا جاتا ہے، کوئی ذرا دیر کیلئے رک جاتا ہے اور کسی کی ''آوت جاوت'' جاری رہتی ہے لیکن شوکت کی مرکزیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نئے آہنگ کا یہ خاکہ ناقدینِ فن سے اپنی شاندار حیثیت کو تسلیم کرائے بغیر نہیں رہے گا۔

ایک اور غضب کا خاکہ ''رودادِ رسوائی'' ہے جو انہوں نے لڑکپن کے دوست مرزا نعیم اللہ رسوا کے حوالے سے لکھا ہے جس میں مرزا کی دلچسپ اور دوست نواز شخصیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس خاکے میں مرزا اپنے ہر رنگ اور ڈھنگ میں سامنے آئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس خاکہ کی صورت میں اردو ادب کو ایک تابندہ اور زندۂ جاوید کردار عطا کیا ہے جو مافوق الفطرت نہیں بلکہ بشری جبلت کا حامل ہے۔ اس خاکے میں فتح گڑھ اور گردونواح کی سیاسی، تہذیبی اور ادبی زندگی کی مرقع کشی بھی کی گئی ہے۔ جہاں اسلم فرخی کی ٹولی کی شرارتوں، مشاعروں، مزارات کی رونقوں، فیوض اور اعتقادات سے شناسائی ہوتی ہے وہاں شاہ طالب حسینؒ، حفیظ مجیبی، منشی بابو رام شریف اور بلگرامی کے خاکچے قاری کی ذہنی ضیافت کا سامان بنتے ہیں۔

''انّ ربی قریب مجیب'' بچوں کے ادیب الیاس احمد مجیبی سے متعلق سوانحی مضمون ہے جس میں خاکے کی لہریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ شخصیہ ادب کے قاری کے لیے اہم ترین اضافہ ہے کیونکہ مجیبی پر وقت کی گرد اتنی پڑ چکی ہے کہ واقفانِ ادب بھی ناواقف ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کا احسان ہے کہ انہوں نے گرد کے اس ڈھیر کو ہٹا کر ایک فراموش نابغۂ روزگار کو دریافت کیا ہے۔ ان کے فن اور خدمات سے ان کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ اسلم فرخی کی ادبی دیانت داری ہے کہ انہوں نے سوانحی معلومات کا یکسر ذمہ نہیں لیا بلکہ ایک نوٹ میں استفادے کے مواد کا حوالہ بھی دیا ہے۔

۵۹ صفحات پر مشتمل خاکہ ''جان بیتاب'' ڈاکٹر اسلم فرخی کی قریبی عزیزہ جمیلہ خاتون عرف ''باجی آپا'' سے متعلق ہے۔ سارے خاکے میں افسانے کی سی چاشنی ہے ''باجی آپا'' معاشرے کا نہایت عجیب وغریب جیتا جاگتا کردار ہے جو مثبت (کم) اور منفی (زیادہ) رویوں کے ساتھ ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے یہ رویے معاشرے ہی کے دَین ہیں اور انہیں وہی کچھ لوٹاتا ہے اس خاکے سے خاکہ نویس کے گہرے نفسیاتی شعور کا بھی ادراک ہوتا ہے۔ اس خاکے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد شخصیت سے وابستہ کردار ابھرتے ہیں اپنی اہمیت جتاتے ہوئے منظر سے ہٹ جاتے ہیں۔ خاکے کی عمدگی کے پیش نظر مجھے اسے اردو ادب کا لازوال خاکہ قرار دینے میں قطعاً جھجک نہیں ہے۔

''ہوالشمس'' فاضل خاکہ نگار کے دیرینہ دوست شمس زبیری کی داستانِ حیات ہے

kitaboyat.blogspot.com

جس میں ان کی مساعی، عادات، مزاج اور سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اس کتھا میں مشاعروں کا احوال بھی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں خاکہ نگار نے اپنے اور ممدوح کے اشتراک سے نکالے جانے والی ادبی جریدے ''نقش'' کی کہانی کو فنی مہارت سے خاکے کا جزو بنا کر اسے تاریخی ابدیت عطا کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ممدوح نظر انداز ہوا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر اسلم فرخی مشاعروں اور رسالوں کے توسل سے ممدوح کے رویوں کو سامنے لائے ہیں۔ اس خاکے کی رو سے شمس زبیری میں محنت شاقہ، طبعی دشوار پسندی، تلون مزاجی، سیر چشمی، مذہبی بے پروائی، اعلیٰ ظرفی، انسان دوستی، لباس میں سادگی، ادبی سیاست سے دوری، مزاج میں ٹیڑھ پن، کھل کر قہقہہ نہ لگانے کی عادت، عزیزوں سے محبت مگر ملنے جلنے میں احتیاط، حاسدین کی پروانہ کرنا اور موسیقی سے بیزاری جیسے محاسن و معائب کا پتہ چلتا ہے۔

''ظہیر احمد صدیقی — کچھ یادیں کچھ باتیں'' کا عنوان ہی صنفِ ادب کا تعین کر رہا ہے۔ مواد بھی خاکہ ثابت کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم اس مضمون میں ظہیر کی علمی شان، زندہ دلی، مہمان نوازی اور بے باکی کے اوصاف سامنے آئے ہیں۔

''بملک دلبری پائندہ باشی'' درگاہِ عالیہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے سجادہ نشین صاحبزادہ سید محمد حلیم چشتی کا شخصی خاکہ ہے جو حسب معمول دلچسپی اور عمدگی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ خاکہ نگار نے ممدوح میں اخلاص و وفا، دریا دلی، شاہ خرچی، بے باکی، شاہانہ مزاجی، خوش طبعی، جملے بازی، سرمستی و بے نیازی، برجستگی، صاف گوئی، احسان شناسی، وضعداری، بد پرہیزی، قدرتی کشش اور انانیت کے رنگ دریافت کیے ہیں۔

''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' بہت خوبصورت مضمون ہے جس میں محبّ عارفی کی شخصی جھلکیاں ہیں۔ ان کے ہاں کی ایک محفل کی روداد اور شرکاء کا مختصر مختصر تذکرہ بھی مضمون کا حصہ ہے۔ مندرجات علامتی عنوان کی تفہیم میں یوں مدد دیتے ہیں کہ کراچی میں محبّ عارفی کا گھر ہر مکتبِ فکر کے ادیبوں کے اکٹھے ہونے کا ٹھکانہ تھا۔ بیگم کے انتقال کے بعد بیٹے انہیں اپنے پاس ڈیفنس لے گئے اور تاریخی اہمیت کا یہ مکان بک گیا۔ یوں یہ ادبی

ٹھکانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

کسی شخص کی وضع قطع اور ظاہری حالت کی لفظی مصوری کو حلیہ نگاری کہتے ہیں جو عام طور پر خاکے کا جزو ہوتی ہے۔ بعض خاکہ نگار اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ ہر خاکہ نگار اپنے انداز میں شخصیت کا حلیہ بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی بہت سے خاکہ نگاروں کی طرح لمبی چوڑی کہانی نہیں سناتے بلکہ کم سے کم الفاظ میں انفرادی شان کے ساتھ نقشہ کشی کرتے ہیں۔ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کا سراپا دیکھیے:

> ''متوسط قد، قدرے بھاری جسم، مرمروں کا تھیلا تو نہیں تھا لیکن یہ محسوس ہوتا تھا کہ جوانی میں ورزش کرتے ہوں گے پھر چھوڑ دی تو جسم بھاری ہو گیا۔ ایک عدد چھوٹی سی توند، بھاری جسم کی وجہ سے قد دبا معلوم ہوتا تھا مگر اتنا دبا بھی نہیں کہ ناٹوں میں شمار ہو۔ گول چہرہ، چندیا پر محض چند بال، سفید مونچھیں، پتلے ہونٹ، ستواں ناک، آنکھیں چھوٹی اور کسی قدر اندر کو دھنسی ہوئی، گندمی رنگ، مضبوط ہاتھ پیر، ڈھیلی ڈھالی شیروانی اور علی گڑھ کاٹ کے پیجامے میں ملبوس، کبھی کبھی پتلون بھی پہن لیتے تھے مگر تکلفاً۔ بعد میں صرف شیروانی ہی پہنتے رہے۔ ساری زندگی اسی وضع میں گزار دی۔ منہ میں نقلی بتیسی تھی۔ دانت کب نکلوائے، کیوں نکلوائے، کسی کو خبر نہیں۔''

جی چاہ رہا ہے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا حلیہ بھی لکھ دوں تا کہ خاکہ نگار کے جوہر کا صحیح اندازہ ہو سکے:

> ''لمبا قد لیکن بربنائے انکسارِ خم، دہرا بدن کہ طلبِ علم تو ریاضت میں خستگی سے محفوظ رہے۔ گول چہرہ دائرہ شریعت کی حدود کا ترجمان، آنکھوں میں شرم و حیا اور معرفت کی قندیلیں

kitaabiyat.blogspot.com

روشن۔ ''سیما ھم فی وجوہ من اثر السجود'' رعونت
کی سرکوبی کے لیے ترکی ٹوپی سے مزین سر پر خلق کے آثار۔
محاسن میں پاکیزگی کا حسن، گندمی رنگ میں طمانیت کی جھلک،
معمولی سوتی شیروانی، علی گڑھ کٹ کا پیجامہ، پاؤں میں سادہ سی
گرگابی۔''

ڈاکٹر انور سدید نے اسلم فرخی کی نثر میں محمد حسین آزاد کی چاشنی تلاش کی ہے۔ ان خاکوں کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ ٹھیٹھ روزمروں، محاوروں اور ضرب الامثال سے مرصع نثر ہمیں محمد حسین آزاد کے زمانے میں تو نہیں لے جاتی البتہ اسلم فرخی کے زمانے کی ضرور خبر دیتی ہے۔ اس نسل کے بزرگوں کی نوکِ زبان پر یہ محاورے اور روزمرے آج بھی ملیں گے۔ ان کے خاکوں میں علم کی دھونس گانٹھنا، کپا مارنا، پوتھ پورا کرنا، بٹے کھاتے میں ڈالنا، تھل بیڑا نہ ہونا، مچیتا ہونا، کنووں میں بانس ڈالنا، پھول پان سمجھنا، ہتے پر ٹوکنا، نیاں ہونا، اینڈوی بنانا، ڈونکنا، ہمکنا، خوخیانا، موتو بلاؤ بننا، جھونک کھانا، چھکوں پھکوں رونا، ہاتھوں ہاتھ گونا کرنا، بھناس ہونا، الاطونی ہانکنا، ہنڈتے پھرنا، ٹکھائیوں کے منہ لگنا، ساکھا کیا، کھسانے، سونٹھ کی ناس، حق تو سبحان تو، چھل بٹے، گھونچو آدمی، اُخور کی بھرتی، تڑک بھڑک، کانکھتے کراہتے، کوئلی، بکھان، تناتنی، پوقدمے، بیت بحثی، سینک سلائی، نمیا پھوس جیسے بے شمار نادر روزمرے ومحاورے جگمگ جگمگ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاکوں کے ذریعہ اس خزانے کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اگلے ایڈیشن میں نئے قاری کی تفہیم کے لیے ایسے محاوروں اور الفاظ کی فرہنگ بھی دے دی جائے تاکہ زبان آشنائی کے ضمن میں نسلی بُعد کم سے کم ہو۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکوں کے مجموعوں میں جہاں لفظیات کے خزانے پائے جاتے ہیں۔ وہاں ہمیں مجمع ناجائز، ماہیانِ شب گوں کے شکاری جیسی عمدہ تراکیب بھی نظر آتی ہیں۔

اسلم فرخی صاحب نے ضمیر نیازی کے خاکے میں لکھا ہے کہ انہیں ہر لفظ اور خیال کے ساتھ کوئی شعر، کوئی ضرب المثل اور کوئی محاورہ یاد آتا ہے۔ گھر والے ان کی اس یادداشت سے محظوظ ہونے کے بجائے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ عادت ان کی نثر میں بھی بدرجہ کمال تک پہنچی نظر آتی ہے کہ بات بات پر ضرب المثل، مصرعہ اور شعر وارد ہوتا ہے۔ یہ قمقمے ہر صفحے پر ضوفشاں ہیں۔ ان کی اس عادت نے خاکے کو وقار بخشا ہے اور ان کے اسلوب میں شان پیدا کی ہے۔ ادب کا سچا قاری محفوظ نہیں ہر ہر قدم پر محظوظ ہوتا ہے۔ فارسی مصرعوں اور اشعار کے لمس نے فرحت آفرینی عطا کی ہے۔ اس کے علاوہ قرآنی آیات کے انوار بھی خاکوں کو تابناکی بخشتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی آغاز و اختتام کے فن میں مشاق ہیں۔ ان کا ابتدائیہ اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ قاری چند سطریں پڑھنے کی نیت کرتا ہے لیکن پورا خاکہ پڑھ کر دم لیتا ہے اختتامیہ بھی تشنگی سے پاک ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں وہ بعض دوسروں کی طرح قاری کی فہم کا امتحان نہیں لیتے۔ حروف آغاز میں مختلف تیکنیک استعمال کرتے ہیں۔ کہیں بے ساختگی ہے اور کہیں قصہ خوانی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، اشرف صبوحی اور تابش دہلوی کے خاکوں کے آغاز میں افسانویت اور قصہ گوئی کا گمان ہوتا ہے۔ کرار نوری کے ابتدائیہ میں گفتگو کا سا انداز دکھائی دیتا ہے۔ بے ساختگی کے ضمن میں مسرت علی سرور کے خاکے کا آغاز عمدہ مثال ہے۔ بعض خاکے ایسے بھی ہیں کہ جس نکتے سے شروع کیا اسی پر ختم بھی کیا۔ کچھ احوال اپنے ضمیر کا، ہوالشمس اور لال سبز کبوتروں کی چھتری کو اس ضمن میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

خاکہ نگار کے لیے شخصیت سے وابستہ کرداروں سے بچ نکلنا ناممکن سی بات ہے۔ اگر پہلو تہی کی جائے تو زیر بحث شخصیت کے حقیقی رنگ سامنے آنے سے رہ جائیں گے جبکہ بعض ضمنی کردار اتنے توانا ہوتے ہیں کہ ممدوحِ اصل پر غالب آنے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ بعض اوقات خاکہ نگار کی کمزوری اسے موضوع سے دور سے دور کر دیتی ہے۔ وہ ضمنی شخصیات اور واقعات کے جنگل میں دیر تک گم رہتا ہے۔ جب کہ خاکہ لکھنے کے دوران ہوش مندی اور

kitaabiyat.blogspot.com

مشاقی کی ضرورت ہوتی ہے ڈاکٹر اسلم فرخی اس معیار پر سو فیصد پورے اترتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہر خاکے میں ایک دنیا آباد ہے۔ لیکن وہ ہر کردار کو اس کی حد تک رکھتے ہیں۔ پھر مرکزی شخصیت پر آجاتے ہیں۔ وہ اکثر چند سطور میں ہی ضمنی کردار کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ جنہیں خاکے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکے میں قاری عباس حسین، اشرف صبوحی کے خاکے میں مولوی بشیر الدین، غلام ربانی تاباں کے خاکے میں ہندو وکیل، حمید نسیم کے خاکے میں 'دوسرے صاحب' کے تذکرے اس ضمن میں اہم مثالیں ہیں۔ ان کا جملہ معترضہ مختصر ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہوئے مدہوش نہیں ہوتے جبکہ بعض خاکہ نگار صفحے کے صفحے صرف کر دیتے ہیں وہ چند سطری جملہ معترضہ کو بھی طویل سمجھتے ہیں۔ وفا فرح آبادی کے خاکے میں الیاس احمد مجیبی کا جملہ معترضہ نو سطروں پر مشتمل ہے۔ جسے انہوں نے طویل قرار دیا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکے ان کے ذوقِ تصوف کے عکاس ہیں۔ ان کا کوئی بھی خاکہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے تذکرے سے خالی نہیں۔ وہ عشقِ سلطانی میں اتنے سرشار ہیں کہ حضرت سلطان جیؒ کے اقوال و واقعات برجستہ و برمحل در آتے ہیں۔ ایک اور اہم بات یہ کہ تینوں کتب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو مذہبی عصبیت کا آئینہ دار ہو۔ ورنہ تصوف اور اولیائے کرام سے محبت و عقیدت کے بڑے بڑے دعویدار مخالف نقطۂ نظر پر کیچڑ اچھالتے اور طعنہ زنی کرتے نظر آتے ہیں۔ نقشبندیہ سلسلہ عام طور پر دیوبندی حضرات کے عقاید کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ عوام الناس میں دوسرے سلسلوں کے معتقدین اس سے متعلق افراد سے موانست کی بجائے بیر رکھتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی کا رویہ یہاں قطعی مختلف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اولیاء اللہ کی روایت پر عمل پیرا ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نقشبندیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ جہاں بھی ان کا ذکر آیا پیر و مرشد لکھا۔ اس کے علاوہ ان کے مرشد سید زوار حسین شاہؒ کے حوالے سے بھی نہایت ارفع خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اللہ والوں کو فرقوں کے خانوں میں نہیں بانٹا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے خاکوں کا ایک وصف یہ ہے کہ کسی کا منفی تذکرہ ہوا تو انہوں نے

پردہ داری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس شخص کا نام دینے سے گریز کیا۔ ایک شخص، ایک شاعر یا ایک بڑے افسر کہہ کر بات شروع کی یوں ان کا کوئی بھی خاکہ کسی کی دلآزاری کا باعث نہیں بنا۔ ان کی یہ خوبی اولیائے کرام سے سچی محبت کی مرہونِ منت ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی اپنے ممدوح کی کسی عادت، رویے اور طرزِ عمل کا مروجہ قدروں سے موازنہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے بے شمار مقامات پر بگڑتی ہوئی اقدار اور معاشرتی انحطاط کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر مشیر الحق کے خاکے سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> ''سیدھے سادے آدمی۔ اپنے خیالات کی جنت میں مگن۔ اپنے کام سے کام۔ وہ جو ایک عام روش ان دنوں رائج ہوگئی ہے کہ کام کم سے کم۔ باتیں زیادہ سے زیادہ۔ پی آر کرتے رہو۔ شخصیت سازی پر زور دیتے رہو۔ اپنا ڈھول خود ہی پیٹتے رہو۔ مشیر میاں اس ڈھب کے آدمی نہیں تھے۔''

ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی کے خاکے کا اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے:

> ''میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی میں بڑے مطمئن تھے۔ میں نے اکثر اپنے ساتھیوں کو ذہنی گھٹن کا شکار محسوس کیا ہے۔ یہ نہیں ہے۔ وہ نہیں ہے۔ یہ محرومی ہے۔ یہ کمی ہے۔ ہماری قدر نہیں ہے۔ ہمیں اپنی صلاحیت کے بھرپور اظہار کا موقع نہیں ملا۔ مگر صدیقی صاحب کی زبان سے نہ کوئی شکوہ سننے میں آیا نہ شکایت۔''

ڈاکٹر اسلم فرخی اپنے خاکوں میں صورتحال پر مختصر تبصرہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین کے اندازِ تدریس بتانے کے بعد ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> ''افسوس یہ ہے کہ سنجیدگی، متانت اور بردباری تدریس کے

kitaabiyat.blogspot.com

پیشے سے دور ہوتی جارہی ہے طلبہ کتابیں پڑھنے کے بجائے
خلاصوں پر گزارا کر لیتے ہیں۔''

جب وہ ادا جعفری کے گھر کے باہر ان کے شوہر نورالحسن جعفری کے بجائے ادا کے نام کی تختی لگی دیکھتے ہیں تو اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

''بزرگوں کے قول کے مطابق گھر گھر والی سے ہوتا ہے۔ اگر گھر
پر گھر والی کا نام لکھا ہے تو تمہاری مردانگی کو کیوں صدمہ پہنچا۔''

واصل عثمانی کے خاکے میں شاگردوں کی محبت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''واصل صاحب شاگردوں سے محبت کرتے ہیں۔ شاگرد ان
سے محبت کرتے ہیں۔ انسانی رشتوں کا مسئلہ بھی یہی ہے اگر
ایک طرف سے خیر کا اظہار ہوتا رہتا ہے تو دوسری طرف سے
بھی کچھ نہ کچھ جوابی کارروائی ضرور ہوتی ہے۔ آنکھوں پر
ٹھیکری رکھ لینے والے ہوتے ضرور ہیں مگر کم ہوتے ہیں اور
انہیں نظر انداز ہی کیا جاتا ہے۔''

''حکیم چٹکلے باز'' میں حکیم مانی کے غیر روایتی طریقِ علاج کے مثبت نتائج کو دیکھنے کے باوجود اپنے متشکک رہنے پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''آدمی روایت کے بندھن میں جکڑا ہوا ہو تو اسے کسی کی بھی آزاد
روی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔''

ڈاکٹر اسلم فرخی نے خاکوں میں اپنے دور کی تہذیبی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ وہ صرف سنہرے ماضی کا راگ نہیں الاپتے بلکہ اس کی کجیوں کو بھی دیانتداری سے احاطۂ تحریر میں لاتے ہیں۔ ''جانِ بیتاب'' سے چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''عجیب عجیب رواج اور دستور تھے۔ منجھلے میاں شہر کے رئیس
تھے مگر انہیں پر کیا منحصر، سارے کھاتے پیتے زمیندار گھرانوں

میں یہی ڈھرا تھا کہ بیٹیوں کی شادیاں تو ہوتی تھیں مگر شادی
کے بعد رہتی وہ میکے میں تھیں۔ شوہر چھٹے چھ ماہے مہمان طریق
آتے۔ بیویوں کو گراں بار کرتے اور رخصت ہو جاتے۔ اگلا
پھیرا بچے کی پیدائش کے بعد ہی ہوتا۔ جب خط جاتا کہ بیوی
اللہ رکھے چلہ نہا چکی ہیں تو خوشی خوشی آدھمکتے تھے۔ کبھی کبھی
لڑکیاں سیر و تفریح کے لیے سسرال بھی ہو آتی تھیں۔ شوہر اگر
باہر ہیں تو باہر کا پھیرا بھی کر لیتیں مگر ہیڈ کوارٹر میکے ہی میں رہتا۔''

یہ تو تھا ماضی۔ لیکن دور حاضر کی معاشرت پر بھی تنقیدی نظر ڈالنے سے نہیں چوکتے۔ ''درویش خدامست'' کی یہ عبارت دیکھیے:

''محمد احمد سبزواری نے ساری زندگی جد و جہد میں گزاری ہے۔
اگر وہ تیسری دنیا کے باشندے نہ ہوتے تو ان کے کارناموں کو
سراہنے کے لیے اکیڈمیاں اور ادارے بنتے۔ ان کی تحقیق کی
روشنی میں مزید تحقیق ہوتی۔ کسی من چلے کو خیال نہیں آیا ورنہ
شاید اکیڈمی تو یہاں بھی بن جاتی مگر اس وقت اس اکیڈمی کی
سبزہ زار میں نغمہ شادی کی گونج، ریشم کی سرسراہٹ، چوڑیوں
کی کھنکھن اور دیگوں کی ٹھنا ٹھن میں کان پڑی آواز نہ سنائی
دیتی۔ گنہگار آنکھیں یہ تماشے شب و روز دیکھتی رہتی ہیں .....
یقین نہ آئے تو نیپا چورنگی پر ایک مایہ ناز درویش مصور کے
نام سے موسوم ہونے والی آرٹ گیلری میں شاعروں کی بہار
دیکھ لیجیے۔''

خاکہ ذاتی مشاہدے کی روشنی میں لکھا جاتا ہے اس لیے خاکے میں حوالے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے ہاں یہ رویہ عام تو نہیں لیکن کہیں

kitaabiyat.blogspot.com

کہیں وہ ایسا بھی کر گزرے ہیں شاید اس لیے کہ شخصیت کا ایک اور پوشیدہ پہلو سامنے آئے۔ جیسے نورالحسن جعفری کے خاکہ ''نور علیٰ نور'' میں مختار مسعود کی تصنیف ''لوحِ ایام'' سے ایک اقتباس ہے جس میں نورالحسن جعفری کے انتقال کے بعد اخباروں میں شائع ہونے والی شہنشاہ ایران، صدر ایوب، غلام اسحٰق خان، نورالحسن جعفری اور مختار مسعود کی ایک تاریخی تصویر کی روداد ہے۔ ایسے اقتباسات اس لیے بھی نہیں کھلتے کہ شخصیت کے حوالے سے نئی اطلاع ملتی ہے لیکن حوالوں کی بھرمار ہو تو وہ خاکہ نہیں رہتا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی ایک مشاق خاکہ نگار ہیں اس لیے وہ بدعتِ حسنہ کی حد تک عمل پیرا ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے دو تین مقامات پر اپنے ناقدین کے اس اعتراض کو دہرایا ہے کہ وہ کمزوریوں سے عمداً گریزاں ہوتے ہیں جب کہ ان کا مؤقف یہ ہے کہ:

> ''اچھائیوں کو اجاگر کرنا اور ان کے اظہار سے انسانیت کے روشن مستقبل کے امکانات کو واضح کرنا میری خاکہ نگاری کا بنیادی مقصد ہے۔''

وہ بشری کمزوریوں کا اعلان عام کرنے کے بجائے بے ضرر انداز میں اشارے کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں:

> ''تحریر کا زہر ہمیشہ رہنے والا ہے۔ زندگی میں اور الجھنیں کیا کم ہیں کہ میں تحریر کی زہرناکی سے اپنے قارئین کی خلش میں اضافے کرتا رہوں۔''

خاکے کا بھی یہی مقصد ہے کہ ایسی پیرائے میں نقائص بیان کیے جائیں کہ کردار کشی کا گمان نہ ہو اور ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے بہت سے خاکوں میں ممدوحین کے معائب کو احسن طریقے سے بیان کیا ہے کہ کسی کی اہانت یا دل آزاری نہیں ہوتی خود ممدوح اسے بخوشی قبول کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ وہ پیرزادہ قاسم کی ایک کمزوری کو ''جلتا ہوا دیا'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''شرکت کی ہامی بھرنے میں پیرزادہ بھی کبھی تامل نہیں کرتے مگر نجانے کیا بات ہے کہ جب بھی انہیں مدعو کیا کوئی نہ کوئی امر اس طرح مانع ہوا کہ ان کی شرکت نہ ہو سکی۔ بہرحال میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ بلائے جانے پر کسی انکار سے کام نہیں لیتے مگر شرکت نہیں کرتے۔ اردو غزل کے محبوب شاعر کی اس ادائے محبوبانہ میں بھی شخصیت کا ایک رخ اور ایک آن ہے۔ میں نے اس آن سے مفاہمت کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ اگر کبھی مدعو کرنے کی نوبت آئی تو مدعو ضرور کیا مگر ان کا انتظار نہیں کیا۔ انتظار نہ کرنے میں انتظار کرنے سے زیادہ لذت ہے۔''

صاحبزادہ حلیم چشتی حضرت خواجہ غریب نواز کے سجادوں میں سے تھے ان کی بشری کمزوری کا بیان اس لیے بھی دشوار تھا کہ اعلیٰ نسبت کے سبب ادب مانع تھا جبکہ شخصیت کے کسی واضح حصہ کو نظر انداز کرنا ادبی بددیانتی تھی۔ اس مشکل مرحلے کو ڈاکٹر اسلم فرخی نے خوش اسلوبی سے یوں طے کیا:

> ''درمیاں میں پر لطف باتیں بھی کرتے جاتے تھے...... مگر اس میں گاہے گاہے اور موقعے موقعے سے بعض ایسے الفاظ کی پچی کاری بھی کرتے جاتے تھے جو مرغوبِ خاص و عام ہونے کے باوجود تحریر میں نہیں لائے جاتے۔''

بہت سے خاکہ نگاروں کے ہاں ان کی ذات اتنی بار جلوہ ریز ہوتی ہے کہ کتاب ختم ہونے تک قاری کو خاکہ نگار کے بارے میں جاننے کی حاجت نہیں رہتی۔ بعض تو ایک ہی بات کو اس قدر دہراتے ہیں کہ قاری جھنجلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے ہاں یہ صورتحال تو نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی موقع پر اپنی کوئی عادت یا بات یاد آگئی تو مختصراً اظہار کر دیا۔
ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی کے مطالعاتی کمرہ میں قرینہ دیکھ کر یہ لکھنے پر مجبور ہیں:

kitaabyat.blogspot.com

''یہاں یہ کیفیت ہے کہ کتاب کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔''

ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی کی یہ عادت کہ وہ صرف موضوع سے متعلق کتاب ہی پڑھتے تھے اور ادھر ادھر کی چیزیں نظر انداز کر دیتے تھے، لکھتے ہوئے اپنے حوالے سے خیال آجاتا ہے:

''مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ عمرِ گراں مایہ کا بڑا حصہ فضول چیزیں پڑھنے میں گزر گیا۔''

کسی کتاب کے حوالے سے ادا جعفری نے ڈاکٹر فرخی کو یہ بتایا کہ ان کے شوہر نے اسے پہلے پڑھا پھر خلاصہ تیار کر کے دیا تھا۔ اس بات پر ڈاکٹر اسلم فرخی نے نورالحسن جعفری کو حیرانی اور احترام کے ساتھ دیکھتے ہوئے سوچا:

''ایک کمترین شوہر ہونے کے باوجود بھی میں اس محنت شاقہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

اور یہ جملہ تو ایک سے زیادہ مقامات پر لکھا ہے کہ ''میں ملنے جلنے سے ذرا گھبراتا ہوں۔'' فاضل خاکہ نگار کی اپنی ذات کے حوالے سے معلومات اجمالاً اور خال خال مقامات پر ہیں اس لیے عیب کے بجائے بھلی لگتی ہیں۔

معروف شخصیات کے خاکے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں جبکہ غیر معروف لوگوں کے خاکے قاری کے لیے اتنے پرکشش نہیں ہوتے۔ واقفانِ ادب تو ایسی تحریر کو یکسر نظر انداز کرنے میں عافیت سمجھتے ہیں لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی کے اسی نوع کے خاکے زیادہ جاذبیت رکھتے ہیں ''جان بیتاب'' تو اردو ادب کا شاہکار اور ہمیشہ زندہ رہنے والا خاکہ ہے جو خاکہ نگار نے اپنی رشتہ کی بہن کے حوالے سے لکھا ہے۔ غیر علمی اور گمنام شخصیت ہونے کے باوجود خاکہ نگار نے اسے ادب کا زندہ جاوید کردار بنا دیا ہے۔ حمیدہ اختر رائے پوری نے بھی اسی قسم کے اعلیٰ پائے کے خاکے لکھے ہیں لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی کے ممدوحین کی تعداد ان سے زیادہ ہے اس لیے اسلم فرخی کو حمیدہ پر فوقیت حاصل ہے۔ انجم اعظمی، ڈاکٹر مشیر الحق، مسرت علی سرور، غلام ربانی تاباں، ضمیر الدین احمد، پروفیسر حبیب اللہ خان غضنفر، ڈاکٹر یاور عباس، نورالحسن

جعفری، ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی، مولوی ثناء الحق صدیقی، حکیم مانی، پتلے اکرام، واصل عثمانی، محمد احمد سبزواری، ضمیر نیازی کا مقام اپنی جگہ لیکن یہ سب معروف ترین نہیں تھے۔ حکیم مانی اور پتلے اکرام کو تو سبزۂ بیگانہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ''لال سبز کبوتروں کی چھتری'' کے تمام خاکے علم وادب کی گمنام شخصیات پر ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کا احسان ہے کہ انہوں نے ان درخشندہ ستاروں کی تصویروں کو ادب گیلری میں آویزاں کر کے انہیں گمنامی کی وسعتوں میں کھو جانے سے روک دیا۔

یہ درست ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے تقریباً تمام خاکے تعزیتی یا تقریباتی ہیں لیکن اور لوگوں کی طرح نہیں کہ ادارتی شذروں اور کالموں کو یکجا کر کے خاکوں کے نام سے چھاپ دیا جاتا ہے۔ ان کے خاکے پڑھ کر یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگتی کہ لکھ تو وہ تعزیتی یا تقریباتی تحریر رہے تھے لیکن ان کے ذہن میں خاکہ کلبلا رہا تھا یا ذہن کے کسی حصہ میں یہ ضرور تھا کہ وہ خاکہ لکھ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تحریر منضبط نہ ہوتی۔ فنی لوازم کی پاسداری نہ ہوتی۔ بہت سے دوسروں کی طرح چھلانگیں ہی چھلانگیں ہوتیں۔

طویل تحریر پڑھنے کے لیے طبیعت کو آمادہ کرنا پڑتا ہے لیکن اسلم فرخی پر یہ اصول منطبق نہیں ہوتا ان کے طویل خاکے قاری کے صبر کا امتحان نہیں لیتے بلکہ اسے اتنا مگن رکھتے ہیں کہ طوالت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے طویل خاکے ہی زیادہ مؤثر اور جاندار ہیں۔

اسلم فرخی پر یہ اعتراض ضرور ہوگا کہ انہوں نے اپنے ممدوحین کو اعلیٰ ظرفی کا پیکر، بلندی کردار کا مجسمہ اور فرشتہ صفت ظاہر کیا ہے لیکن اس انداز سے بھی تو سوچا جا سکتا ہے کہ ان کے ممدوحین میں خوبیوں کا پلڑا بھاری تھا، وہی رنگ گہرے تھے اس لیے پھیکے رنگوں پر چھا گئے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے شخصیت سے متعلق ہر قسم کی تحریروں کو جمع کر کے خاکے کا نام نہیں دیا بلکہ خاکہ نگاری کو سنجیدگی سے اختیار کیا یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے معرکہ الآراء خاکے ظہور پذیر ہوئے جو اردو خاکہ نگاری میں اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁

kitaabiyat.blogspot.com

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

ہم اپنے مشاہیر کے بارے میں جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ان کی ذات کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولات سے آگہی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اسی خواہش نے فنِ خاکہ نگاری کو جنم دیا۔جس نے آگے چل کر بہت سے روپ بدلے۔کہیں عقیدت مندی کی شکل میں،کہیں لفظوں کے کارٹون گری میں،کہیں سچائیوں کی چشم پوشی میں،کہیں حقیقتوں کے بیان کا سہارا لے کر بے لباس کرنے میں،کہیں نفسیاتی تجزیے میں اور کہیں داستان طرازی میں۔ہر ایک نے دعویٰ کیا خاکہ بس یہی ہے جو ہم نے لکھا۔دوسرے انداز اور اسلوب کا حامل اس فن پر پورا نہیں اترتا۔لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ سب خاکے درست ہیں۔سب نے اپنی صلاحیتوں اور سوچ سے اس فن کو حسن بخشا ہے۔سب کی مشترکہ کاوشوں نے اسے یک رنگ ہونے سے بچالیا ہے۔اسے رنگا رنگی عطا کی ہے۔ان رنگوں نے فن خاکہ نگاری کو حسین تر بنا دیا ہے۔جس کو جو رنگ بھائے وہ اسے اپنا لے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے خاکہ نگاری کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے جو اصول پیشِ نظر رکھا وہ یہ تھا کہ اپنے ممدوحین کے انہی پہلوؤں پر زور دیا جائے جن سے ہماری زندگی اور ماحول روشن ہو سکے ان کے خیال میں:

''آج بہت اندھیرا ہے اور ضرورت چراغ جلانے کی ہے شاید
وقت کی محراب میں روشن ان چراغوں کی روشنی قلب و نظر کو
متاثر کر سکے۔'' (ص:۱۳)

واقعات نگاری خاکے کو جہاں دلچسپ بناتی ہے وہاں متعلقہ شخصیت کے بارے میں دی گئی رائے کو بھی وقیع بناتی ہے۔قاری محاسن یا معائب کے بیان میں واقعے کو ضروری سمجھتا ہے اسی لیے یہ عنصر خاکہ نگاری کے لیے لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے

اس فنی ضرورت کا خاص خیال رکھا ہے جس کی وجہ سے مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، اسرارالحق مجاز، ڈاکٹر سجاد، نیاز فتح پوری، ثاقب کانپوری، ممتاز حسن، ڈاکٹر محمد حسین اور عبدالکریم سومار کے حوالے سے لکھے گئے خاکے قاری کے ذہن پر تادیر نقش رہتے ہیں۔

حلیہ نگاری خاکہ نویسی کا جزو ہے۔جس طرح ہر مصور اپنے موئے قلم کو بروئے کار لا کر اپنے ہی انداز سے خدوخال واضح کرتا ہے جو حقیقت سے قطعاً مختلف نہیں ہوتے اسی طرح ہر قلمکار سراپا نگاری میں اپنے فن کا اظہار کرتا ہے۔ڈاکٹر کشفی کا انداز سراپا نگاری ملاحظہ ہو:

''فیض نے تو اپنے رقیب سے ایک بات کہی تھی جو محمود حسین خاں کے رفیق ایک دوسرے سے کہہ سکتے ہیں:

تو نے دیکھی ہے، وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ

محمود حسین خاں کا چہرہ آپ کے مطلع ذہن پر ابھر کر اس مصرعہ کو عاشقانہ فضا سے نکال کر انسانی کردار اور ذات کی دنیا میں لے جائے گا۔محمود حسین خاں کی پیشانی جیسے فکر، بلند طالعی اور ذہانت کی سجدہ گاہ تھی۔ان کے رخساروں کی تمتماہٹ غیرت کا اشارہ تھی اور ان کے ہونٹ سچائی کا نشیمن تھے ....

دل ان کا ایسا آئینہ تھا جو گردِ کدورت سے سدا صاف رہا، ذہن ایسا تھا کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کا تجزیہ دیکھتے ہی دیکھتے کر لیتے اور خدوخال ایسے تھے کہ پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں۔ان کی ماتھے پر شرافت کا غرور اور ہونٹوں پر صداقت کا نور چمکتا تھا۔ان کی جنبشِ دست اور چہرہ کی حرکات ان کی باتوں، روح اور ذات سے پیوستہ رہتیں۔یوں لگتا کہ جیسے ان کے جنبش کرتے ہوئے ابرو اور آنکھوں کی مسکراہٹ کا ان کی گفتگو میں وہی حصہ ہے جو اچھے شعر کی تعمیر میں استعارہ اور تشبیہہ کا ہوتا ہے۔'' (ص:۱۰۹۔۱۱۱)

kitaabiyat.blogspot.com

دیکھئے کس حسن وخوبی اور چابکدستی سے ڈاکٹر محمود حسین کا سراپا بیان کیا ہے کہ ان چند سطور میں ظاہری و باطنی شخصیت پورے طمطراق سے ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ قاری جہاں ممدوح کے حسن اور بلند قامتی کا ادراک کرتا ہے وہاں وہ تحریر کی دلکشی و رعنائی سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔

کشفی صاحب زبان و بیان کی نزاکتوں کا بھرپور ادراک رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر قوسِ قزح کے رنگوں اور جھلملاتے ستاروں کی خصوصیات لیے ہوتی ہے۔ ان کے بہت سے خاکوں میں افسانوی رنگ پایا جاتا ہے لیکن اسرار الحق مجاز کے خاکے میں ان کا یہ رنگ اور زیادہ شوخ ہو جاتا ہے:

''مجاز کی زندگی کا بڑا حصہ رومانی دھندلکوں میں گزرا۔ کسی نے اپنی آنکھوں میں خمارِ شب کے ساتھ ہنگامِ سحر اس کا خیر مقدم کیا۔ اپنے عشقوں میں وہ ناکام نہیں رہا۔ اس کے یہاں بڑا ہی نشاط رہا۔ مجاز کا دعویٰ ہے کہ

کامرانی ہے پرافشاں مرے رومانوں میں

کسی نے دلداریٔ نسیم بہاراں، تابندگی صبح درخشاں اور ہنسی کے نرم طوفان میں شمع فروزاں کے ساتھ اس کا انتظار کیا ہے۔ کسی کے کھلے ہوئے لبوں کے گلستان نے اس کی عیادت کی ہے۔ وہ جب تک علی گڑھ میں رہا گرلز کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیوں کے خوابوں پر حکومت کرتا رہا۔ لڑکیاں اس کے لیے خواب دیکھتیں اور مجاز نئی نئی فتوحات حاصل کرتا رہا۔ اس کی زندگی بستر مخمل و سنجاب تھی۔ اس کی جنت شوق بیگانہ آفاتِ سموم تھی اور اس کی نگاہوں میں بزمِ پرویں کنیزوں کے ہجوم سے زیادہ نہیں چھپتی تھی کہ اچانک ایک زہرہ جبیں بہت سی کہکشانیوں کے ساتھ اس کی زندگی میں داخل ہوئی۔ اس کی زندگی کو تھوڑے سے

نور کی ضرورت تھی اور یہ نور اس ستارے نے اسے بخش دیا لیکن نور کے جلو میں سوز بھی ہوتا ہے۔ وہ زہرہ جبیں مجاز کو نور اور سوز دے کر اس کی زندگی سے بہت دور چلی گئی۔ وہ ایک بڑے لیڈر کی بیٹی تھی اور پھر ایک بڑے آدمی کی بیوی بن گئی۔'' (ص:۵۰)

ڈاکٹر کشفی کے خاکوں میں بہت سی نادر تراکیب دیکھنے کو ملتی ہیں۔ برمحل اشعار و مصرعے بھی ان کی تحریر کو اجالتے ہیں۔ خوبصورت تشبیہات سے وہ شخصیت کے مقام و مرتبے کا تعین کرتے نظر آتے ہیں:

''وطن کا ہر ذرہ انہیں ملک سلیمان سے زیادہ عزیز تھا۔''

''ان کے کردار اور ان کی روح میں غزل کے ایک حسین شعر کے سارے تیور موجود تھے۔'' (ص:۳۲)

کسی مصرعے یا شعر کو نثر میں حسن وخوبی کے ساتھ برتنے کا ہنر ہر ایک کے بس کی بات نہیں لیکن ڈاکٹر کشفی اس فن میں طاق نظر آتے ہیں۔ ان کی شعری تشبیہ و ترکیب کے نمونے ملاحظہ ہوں:

''مشقِ سخن کے ساتھ چکی کی مشقت بھی حسرت کی زندگی۔ وہ کمالِ خاکسار کا نمونہ تھے لیکن ایسی ''قیامت'' بھی تھے جو اپنی داد خود دے کے۔ ان کی غزل پڑھیے تو ''جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم'' اور زندگی پر نظر ڈالیے تو ایک چٹان اور ''دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔'' (ص:۲۶)

''اکبر زمین میں غیرتِ قومی سے گڑے ہوں یا نہ گڑے ہوں، مگر میں ضرور شرمندگی سے زمین میں گڑ گیا۔'' (ص:۱۰۳)

تشبیہ و موازنہ کے باب میں ڈاکٹر کشفی کی نثر کا یہ نمونہ دیکھیے:

''ان کی فطرت سے مزاح کو وہی لگاؤ ہے جو ساز کو نغمہ سے، کانپور کو قلیوں سے، بمبئی کو سیٹھوں سے، لاہور کو ادیبوں سے،

kitaabiyat.blogspot.com

میراجی کو جنسی شاعری سے، عبدالرحمٰن چغتائی کو مؤقلم سے،
اصغر کو تصوف سے، فراق کو غزل سے، سجاد ظہیر کو گھونسہ اور لال
سلام سے اور جدن بائی کو نرگس سے ہے۔'' (ص:۲۱)

کشفی صاحب کے خاکوں کے عنوانات نہ صرف دلکش ہیں بلکہ انہوں نے عنوان کے تین چار لفظوں میں پوری شخصیت کو سمو دیا ہے۔ مثلاً انہوں نے مولوی عبدالحق کے لیے ''شہر اردو کی شہر پناہ'' کا عنوان تجویز کیا ہے۔ حسرت موہانی کے لیے ''گم اس میں تھے آفاق'' اور سیّد سلیمان ندوی کے لیے ''علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد'' بھرپور اور جامع عنوانات ہیں۔

بعض نقاد خاکے کے لیے بشری کمزوریوں کے بیان کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں تصویر تب ہی مکمل ہوگی جب شخصیت کی کسی کجی کو چھپایا نہ جائے۔ اگر کان ٹیڑھا ہے تو اسے ویسا ہی دکھایا جائے، ناک طوطے جیسی ہے تو اسے ستواں بنانے کی کوشش نہ کی جائے، چہرے پر کوئی داغ ہے تو اس پر پلاسٹک سرجری نہ کی جائے۔ خود ڈاکٹر کشفی بھی یہی کہتے ہیں کہ ''ہمیں فرشتوں، راہبوں اور گوشہ نشینوں کی ضرورت نہیں۔ ایسے افراد کی ضرورت ہے جو انسان بھی ہوں اور آدمی بھی۔ لاگ بھی رکھتے ہوں اور لگاؤ بھی۔'' اس کے باوجود کشفی صاحب نے اپنے خاکوں میں لگاؤ کو اجاگر کیا ہے۔ لاگ خال خال ہی نظر آتا ہے۔ کشفی صاحب ہمیں خامیاں تلاش کرتے ہوئے نہیں بلکہ پہلو بچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناگزیر صورتحال میں وہ خامیوں کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ خامیاں ہی رہتی ہیں، گناہ نہیں بنتے۔ مثلاً:

''اولیائے کرام اور بزرگوں سے انہیں عقیدت تھی۔ یہ
عقیدت ''قبر پرستی'' کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک طرف تو
حسرت کا یہ دعویٰ کہ ''میں ایک مسلمان کمیونسٹ ہوں''
دوسری طرف یہ ''قبر پرستی'' سچ ہے۔
''اک طرفہ تماشا تھی حسرت کی طبیعت بھی۔'' (ص:۳۵)

بی اے ہاشمی کے حوالے سے کشفی صاحب لکھتے ہیں:

''ہاشمی صاحب مزے کے آدمی معلوم ہوئے۔ خود پسندی اور
اعتماد کی تصویر۔ اپنے آپ کو مرکز عالم سمجھنے والے نستعلیق اور
رکھ رکھاؤ کے آدمی۔'' (ص:۷۷)

ڈاکٹر کشفی کے خاکوں میں ممتاز حسن کا خاکہ اعلیٰ پائے کے خاکے کی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ اگر اسے شاہکار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ یہی وہ خاکہ ہے جس میں خاکہ نگار اپنے ممدوح کی شخصیت کی پرتوں کو کھولنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جو خاکہ قارئین کے ذہن پر نقش ہو جائے اسے شاہکار کا درجہ دینے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالصمد کا خاکہ ''زمین پر اللہ کا قیدی'' مختصر ہونے کے باوجود بھرپور و پُراثر ہے۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کا خاکہ ''ہماری ثقافت کا قصہ خواں'' کو بھی کشفی صاحب کے اچھے خاکوں میں شمار کیا جائے گا۔

کشفی صاحب کی نثر کے کمالات ان کے والد حضرت ثاقب کانپوری کے خاکے میں آب و تاب کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں ان کی ساری تخلیقی صلاحیتیں یکجا ہو کر جلوے بکھیر رہی ہیں۔ یہ خاکہ عمدہ تصور کیا جا سکتا تھا لیکن ادھورے پن اور تشنگی کے سبب اس اعزاز سے محروم رہ گیا۔ جس زمانے میں یہ خاکہ چھپا تھا اس وقت تک تو ٹھیک تھا لیکن مجموعے کی ترتیب کے موقع پر نظر ثانی کا محتاج تھا۔ حضرت ثاقب کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر واقعات کے ذریعے روشنی ڈالی جا سکتی تھی۔ لگتا ہے کشفی صاحب کو اس کے ادھورے پن پر اعتراضات کا احساس تھا جبھی تو انہوں نے اس کا عنوان ''ایک ادھوری کہانی'' لکھ کر خود کو بچانے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ اختتامی سطور بھی اسی شعوری عمل کی عکاسی کرتی ہیں:

''میں نے شروع کی تھی ایک کہانی اور وہ ادھوری رہ گئی۔ میں
بھی تو تقریر لکھنے لگا۔ یہ رقت کوئی اچھی علامت نہیں اس لیے یہ
کہانی ادھوری ہی چھوڑے دیتا ہوں۔ دیکھئے یہ کب پوری ہو؟
شاید اس کی تکمیل ہم سب کو کرنی ہو۔'' (ص:۹۷)

kitaabiyat.com

کشفی صاحب نے آخری جملے میں مہارت سے بات کا رخ موڑ دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس خاکے کی تکمیل کرتے تا کہ اس کا شمار اردو ادب کے شاہکار خاکوں میں ہو سکتا۔

کشفی صاحب کو ڈاکٹر محمود حسین سے جتنا قرب رہا ہے۔ اس کے پیش نظر وہ ڈاکٹر صاحب پر اس سے کہیں زیادہ اچھا خاکہ لکھ سکتے تھے۔ کشفی صاحب کے حافظے میں ان کے حوالے سے بے شمار واقعات ہوں گے۔ جو ڈاکٹر محمود حسین جیسی ہستی کی عظمت کو نمایاں کرتے۔ کشفی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے لیے Towering personality کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کا حق تب ہی ادا ہوتا جب ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر صراحت سے اظہار خیال کیا جاتا۔ یہ خاکہ پڑھ کر قاری کے ذہن میں یہ جملہ ابھرتا ہے: ''کیا ہی اچھا ہوتا کہ ڈاکٹر محمود حسین سے وابستہ تمام یادیں رقم کر دی جاتیں۔''

نیاز فتح پوری کا خاکہ کسی حد تک تنقیدی مضمون کا اثر لیے ہوئے ہے۔ اس میں شخصیت سے زیادہ فن کو نمایاں کیا گیا ہے۔ وہ محبت میں خاکے کے لوازم بھول گئے اور مضمون کی سرحدوں میں داخل ہو گئے اسی طرح سیّد سلیمان ندوی کے باب میں بھی شخصیت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے ان کے خاکے نے مضمون کا روپ دھار لیا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ اس مضمون کی تحریر کے وقت فاضل خاکہ نگار کے ذہن میں یہ تھا ہی نہیں کہ وہ خاکہ لکھ رہے ہیں۔ اس لیے یہ مضمون خاکے کے لوازم پورے کرتا نظر نہیں آتا۔

عبدالکریم سومار کا مضمون بھی ایک خاص مقصد یعنی ان کی پہلی برسی پر شائع ہونے ن کتاب کے لیے لکھا گیا اس لیے اس میں خاکے کے اصول پیشِ نظر نہیں رکھے گئے۔ اس مضمون میں چونکہ کچھ خاکے کا رنگ پایا جاتا ہے۔ شاید اسی خیال کے پیشِ نظر ڈاکٹر کشفی نے اسے اپنے خاکوں کے مجموعہ میں شامل کر لیا۔

ان معمولی فروگذاشتوں کے باوجود ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی شخصیت نگاری کا فن مسلمہ ہے اور ان کے خاکے اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔

❁❁❁❁

ڈاکٹر آفتاب احمد

ڈاکٹر آفتاب احمد تنقید کی دنیا کا ایک معتبر نام ہے۔ انہوں نے علم و ادب کے ۱۴ درخشندہ ستاروں کے شخصی خاکے تحریر کیے جو ''بیادِ صحبت نازک خیالاں'' کے نام سے مجموعے کی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ان کی خاکہ نویسی کی تحسین میں مشتاق احمد یوسفی اور مشفق خواجہ نے مؤثر کلمات ادا کیے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان کے ہر خاکے کے حوالے سے گفتگو ہوگی۔

پہلا خاکہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ہے جس میں خلیفہ صاحب کی شخصیت کے خدوخال بھرپور ابھرے ہیں۔ قاری ان کے ظاہر و باطن سے آشنا ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کے مطابق خلیفہ عبدالحکیم خوش مزاج، روشن خیال، رجائیت پسند اور مشفق و مطمئن ہونے کے ساتھ ساتھ عصبیت کی حد تک کشمیری بھی تھے۔ سادہ و سلیس زبان میں لکھا گیا یہ خاکہ خاصا پُر اثر اور جامع ہے۔

''پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری'' طویل تحریر ہے جس میں محاسن کے ساتھ ساتھ بشری کمزوریوں پر بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ شہرت بخاری، بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کے واقعات پطرس سے سرسری سا تعلق واضح کرتے ہیں ان سے پطرس کا کوئی وصف ظاہر نہیں ہوتا لیکن تاریخی اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ خاکے میں ان کا بوجھ برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اس خاکے میں کچھ غیر ضروری مواد بھی ہے بالخصوص آخری پیراگراف خاکے کے لحاظ سے قطعی غیر ضروری ہے۔

''ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر'' میں زیادہ تر مواد تاریخی نوعیت کا ہے تاہم شخصی ہیولا بھی ابھر کر واضح طور پر اپنی پہچان کراتا ہے۔ بہت سے مقامات پر خاکے سے زیادہ تاثراتی

kitaabiyat.blogspot.com

مضمون کا گمان ہوتا ہے۔

''فراق گورکھ پوری'' میں فراق کا عکس تو ہے لیکن ان کی مکمل تصویر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ابتدائی چار صفحات فراق کے فن سے متعلق ہیں۔ شخصیت کے حوالے سے غیر ضروری تفصیلات و جزئیات کا اہتمام یہاں بھی ہے۔ اگر کفایت لفظی سے کام لیا جاتا تو جامع خاکہ لکھا جا سکتا تھا۔ ایم ڈی تاثیر کی صفائی میں دیئے گئے استدلال سے تاریخی غلطی کی اصلاح تو ہو گئی لیکن خاکہ کی روح مجروح ہوئی ہے۔ گاندھی کا لطیفہ بھی غیر ضروری ہے۔ اس تذکرے سے شاید ڈاکٹر آفتاب احمد یہ تاثر دینا چاہتے ہوں کہ فراق گاندھی کو غیر معمولی اہمیت نہیں دیتے تھے ورنہ ایسے ہتک آمیز لطیفے کی شمولیت نہ ہوتی۔ اس مضمون میں فراق کی ذات کے منفی پہلوؤں کو بھی مہارت سے پیش کیا گیا ہے یہ جملہ دیکھئے:

''آج فراق صاحب کی زندگی میں پاکستان زندہ باد کا دن تھا۔'' (ص:۱۰۸)

اس نثر پارے میں فراق کی لطیفہ گوئی، جھگڑے میں شائستگی و علمی شان، سفارتی انداز میں مصلحت اندیشی، ہر بات کو تنقیدی زاویئے سے دیکھنا جیسے اوصاف سے آگہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد کی یہ تحریر ملاقاتوں کا احوال تو ہے، خاکہ ہرگز نہیں۔ عبارت میں لاشعوری طور پر ڈاکٹر صاحب کی پاکستانیت در آئی ہے۔

''خواجہ منظور حسین'' میں بھی کئی صفحات فن سے متعلق ہیں تاہم شخصی حوالے سے مواد شخصیت کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جو اثر انگیز بھی ہے۔ فنی مواد کو نکال دینے کی صورت میں ناقدین فن اسے اچھا خاکہ قرار دینے میں ہرگز متامل نہ ہوں گے۔

''مجید ملک'' بھی خاکے کے لوازم پورے نہیں کرتا۔ اسے سوانحی مضمون کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ بہت سا مواد ایسا ہے جو شخصی خاکے کے لیے قطعی غیر ضروری ہے۔ سکندر مرزا اور پاکستان ٹائمز کو قومی تحویل میں لینے سے متعلق واقعات تاریخی تو ہیں لیکن یہ مجید ملک کے کسی شخصی پہلو کو نہیں ابھارتے۔

''صوفی غلام مصطفیٰ تبسم'' عمدہ خاکہ ہے اس میں شخصیت تمام خدوخال کے ساتھ ابھرتی ہے۔ اسی طرح ''غلام عباس'' میں قاری ممدوح سے بھرپور ملاقات کر پاتا ہے۔ جس میں غلام عباس نہ تو فرشتہ ہیں نہ شیطان۔ بلکہ گوشت پوست کے انسان نظر آتے ہیں جو اپنی خوبیوں، خامیوں، دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں تاہم فن سے متعلق آخری گیارہ سطور غیر ضروری ہیں۔

''ن م راشد'' اچھا خاکہ ہے اس میں راشد کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے ان کی ذات کے متعلق منصفانہ و غیر جانبدارانہ انداز فکر اختیار کیا گیا ہے۔

''فیض احمد فیض'' میں خاکہ نگار چھوٹی سے چھوٹی ملاقات اور معمولی سے معمولی بات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس عمل سے خاکہ بعض مقامات پر یادنگاری کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس خاکے میں فیض کی ذات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جہاں عقیدت کا رنگ ہے وہاں فیض کے معترضین کی زبانی نرم الفاظ میں فیض کی کمزوریوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ جی ایم کی دعوت کے واقعہ میں فیض کی شرکت تو ہے لیکن ان کی ذات کا کوئی پہلو واضح نہیں ہوتا اس لیے ذکر بے جا ہے۔ اس کے علاوہ آرٹس کونسل کی سربراہی کا احوال اور شاکر علی کا واقعہ بھی خاکہ کے لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ ان نقائص کے باوجود یہ تحریر مؤثر خاکہ ہے۔

''محمد حسن عسکری'' سب سے عمدہ خاکہ ہے جس میں شخصیت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ عسکری کے کمزور پہلوؤں کے بیان نے خاکے کو نہایت توانا بنا دیا ہے۔ شخصیت کا دیانتدارانہ اور اخلاص نیت سے تجزیہ کیا گیا ہے کہ ذات پر چوٹ نہیں پڑتی۔ خاکہ نگار نے ماہرانہ انداز میں عسکری کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ عسکری کی ذات سے متعلق لکھی جانے والی تحریروں میں شاید ہی اس سے زیادہ اعلیٰ اور متوازن کوئی اور تحریر ہو۔

''پروفیسر حمید احمد خاں'' اختصار و جامعیت کا محتاج خاکہ ہے۔ سوانحی تفاصیل خاکے کو مضمون سے قریب کر دیتی ہیں۔

Kitaabiyat.blogspot.com

''پروفیسر سراج الدین'' منصفانہ انداز تحریر کا مظہر جامع خاکہ ہے۔ محاسن و معائب پروفیسر سراج کی شخصیت کو سمجھنے میں بھرپور مدد دیتے ہیں۔

''ڈاکٹر نذیر احمد'' فاضل خاکہ نگاری کی روایتی خامیوں کے باوجود جاندار خاکہ کہلانے کا مستحق ہے۔

اگرچہ ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنے خاکوں میں حلیہ نگاری پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اس کے باوجود وہ زیرِ نظر شخصیت کو متعارف کرانے میں کامیاب رہے ہیں۔ غلام عباس، ن م راشد، حسن عسکری اور پروفیسر سراج الدین کے خاکے ان کی نفسیاتی سوجھ بوجھ کی دلالت کرتے ہیں۔

اگرچہ ڈاکٹر آفتاب احمد کا اسلوب بیان سادہ و سلیس ہے لیکن ان کی نثر میں مقامات آہ و فغاں، فریاد کی لے، یقین کا اثبات، گمانوں کے لشکر، افسانہ کرند جیسی شعری تراکیب نگینوں کی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ انیسِ حلقہ رنداں، رفیقِ اہلِ جنوں، پریشاں نظری کا لپکا، واماندگی شوق جیسی خوبصورت و نادر تراکیب ان کے خاکوں کو اُجالتی ہیں۔

خاکہ نگاری میں اقتباسات مستحسن تصور نہیں کیے جاتے لیکن ڈاکٹر آفتاب احمد کے ہاں ضروری مقامات پر حوالے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو برے محسوس ہونے کے بجائے شخصی ڈھب کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر آفتاب احمد کے خاکوں کے مجموعے کا پہلا باب ''فورسٹر، لیوس اور ایلیٹ سے ملاقاتیں'' ہے جس میں تینوں مشاہیر سے ملاقاتوں کا احوال ہے۔ ڈاکٹر ایف آر لیوس کے حوالے سے لکھی گئی تحریر کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر آفتاب احمد ایک ہی ملاقات میں شخصیت کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جس کے سبب یہ تحریر کامیاب خاکہ کے معیار پر پوری اترتی ہے جو ان کے فنی کمال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد کا خاکوں کا ایک وصف روادارانہ رویہ ہے۔ وہ انکشافات کی آڑ

میں دلآزاری نہیں کرتے بلکہ بعض نازک مقامات پر اتنے محتاط ہیں کہ نام لکھنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ وہ ایسا خوف فسادِ خلق سے نہیں بلکہ اس خیال سے کرتے ہیں کہ کسی کی اہانت نہ ہو۔ ورنہ لوگ تو خاکہ کے پردے میں ضمنی شخصیات کے خلاف بھی خوب بھڑاس نکالتے ہیں۔ اس نکتے کے حوالے سے ایک مثال دیکھیے:

> ''میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک بہت بزرگ ہستی کے فرزند ارجمند جو اب خود ایک بزرگ ہستی ہیں اور سرکار میں ایک بہت اونچے دینی عہدے پر فائز ہیں، عسکری کے کمرے میں پہلے سے بیٹھے ہیں۔'' (ص: ۲۶۵)

یہ جملہ غالباً جسٹس تقی عثمانی کے حوالے سے ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نے تقریباً ہر خاکہ میں ممدوح سے متعلق شخصیات کا اجمالی تعارف بھی کرایا ہے جن میں سے اکثر میں خاکہ کی چاشنی ہے۔ مثلاً صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے خاکہ میں یوکرامت کا ذکر اور ڈاکٹر نذیر احمد کے ضمن میں وکٹر کینن کا تذکرہ۔ چونکہ یہ اذکار طول نہیں کھینچتے اس لیے برے محسوس نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے خاکہ میں مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا تذکرہ ذرا زیادہ ہے جو تھوڑی سی مزید معلومات و مواد سے ایک مکمل خاکے کا روپ دھار سکتا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب احمد کی عبارت میں کہیں کہیں الجھے ہوئے جملے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں جس سے ابلاغ میں دشواری ہوتی ہے:

> ''خواجہ صاحب کے معالج جنرل شوکت حسن کو کہ ایم اے او کالج امرتسر میں فیض صاحب کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے ان کے چاہنے والوں اور میرے جاننے والوں میں سے ہیں، جب خواجہ صاحب کے علمی و ادبی رتبے کا علم ہوا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔'' (ص: ۱۲۸)

kitaabiyat.blogspot.com

اسی طرح یہ غیر فصیح جملہ بھی دیکھئے:

’’جب ان کی شکایتوں نے طول کھینچا تو ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے کہا کہ شاکر کے والد کے دوست رہے تھے اور شاکر کو بہت عزیز جانتے تھے، ان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ میاں، کیا باتیں کررہے ہو؟‘‘ (ص:۲۴۰)

بعض خاکہ نگار زیرِ نظر شخصیت کے ذکر کے ضمن میں جابجا اپنے حوالے سے معلومات فراہم کرتے ہیں جو یقیناً غیر مستحسن فعل ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد کے ہاں یہ رویہ عام تو نہیں لیکن کہیں کہیں اپنی ذات کے بارے میں آگاہی بخشتے ہیں۔ چونکہ ایسا کبھی کبھار ہوا ہے اس لیے گوارا ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنے خاکے میں ممدوحین سے ملاقاتوں کے اوقات اور وقفوں سے آگاہ کرنا بھی ضروری سمجھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے متذکرہ شخص سے ہر اہم اور غیر اہم ملاقات کا ذکر کیا ہے جس نے خاکے میں بوجھل پن کی فضا پیدا کی ہے۔

حروف آخر کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر آفتاب احمد کا خاکہ گرچہ کسی حد تک اختصار و جامعیت کا محتاج ہے لیکن انہوں نے اپنے عہد کی اہم شخصیات کو جس انداز میں دیکھا، پیش کردیا۔ انہوں نے نہ تو کسی کے قد کو اونچا کیا نہ نیچا۔ نہ عقیدت پسندی کو راہ دی نہ غیظ وغضب کو۔ نہ کسی کو ہیرو بنایا نہ زیرو کیا بلکہ ذمہ دارانہ رویہ اپنایا جس کے باعث وہ خود کو منصف مزاج خاکہ نگار ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اے حمید

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ افسانہ و ناول نگار اے حمید نے خاکہ نگاری کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے ۳۲ اہل دانش کی قلمی تصویریں ’’چاند چہرے‘‘ میں محفوظ کی ہیں۔ کتاب کا نام اس امر کا غماز ہے کہ انہوں نے ممدوحین کا جائزہ محبت کی خوردبین سے لیا ہے۔

’’چاند چہرے‘‘ کا پہلا خاکہ احمد ندیم قاسمی کا ہے جس کا ابتدائیہ ہی شگفتگی اور اچھوتے پن کا مظہر ہے۔ گہری عقیدت ومحبت میں لکھا ہوا خاکہ ہے جس میں قاسمی صاحب خیر کا مجسمہ دکھائی دیتے ہیں۔ کوہ مری میں منعقدہ مشاعرے کی روداد قاسمی صاحب کی شرکت تو ظاہر کرتی ہے لیکن اس تذکرے سے ان کی شخصیت کے کسی پہلو پر روشنی نہیں پڑتی اس لیے یہ مواد خاکے میں غیر ضروری قرار پائے گا۔

’’سعادت حسن منٹو‘‘ کو اعلیٰ درجے کا خاکہ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں منٹو کا صحیح عکس پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنے اصلی رنگ ڈھنگ میں جلوہ گر ہیں۔

’’فیض احمد فیض‘‘ میں ان کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں کم سخنی، حوصلہ افزائی، سیر چشمی، سخاوت اور کہیں کھو جانے والی کیفیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ اتنے اہم اور تیکھے نقوش ہیں کہ ان سے فیض کی تصویر قابلِ شناخت ہے۔ اس خاکے میں فیض صاحب جمال دکھائی دیتے ہیں۔ ادبی محفل کا احوال، اہلِ قلم کی سرگرمیوں، خرمستیوں اور مزاج کو بھی خاکے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ صورتحال صرف اسی خاکے تک محدود نہیں، تمام پر پھیلی ہوئی ہے جو خاکہ نگار کے اسلوب کا حصہ بن گئی ہے۔

’’حفیظ جالندھری‘‘ ایک کمزور خاکہ ہے جسے یادنگاری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

kitaabiyat.blogspot.com

اس طویل تحریر سے حفیظ کی چند عادتوں اور خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً کندھے کو زور سے دبانا، بات کے دوران مخاطب الیہ کو بار بار اپنی طرف کھینچنا، کفایت شعاری، شفقت، زندہ دلی اور دوست نوازی۔ حفیظ جالندھری چونکہ متنوع اور دلچسپ خصائل کے حامل تھے اس لیے بیان کردہ خطوط سے حفیظ کی تصویر مکمل نہیں ہوتی البتہ دھندلا سا نقش سامنے آتا ہے۔ واقعات میں بھی وہ مرکزی کردار کے طور پر سامنے نہیں آئے کسی واقعے کا مرکزی کردار ابنِ انشاء ہیں اور کسی کا ابراہیم جلیس۔

''ناصر کاظمی'' نہایت جاندار خاکہ ہے جس میں ان کی عادات، مزاج، نفسیات، کیفیات، طور طریقوں، رویوں سب ہی پر اظہار خیال ہے۔ ان سطور میں ناصر کی واضح اور شفاف تصویر Emboss ہوئی ہے۔

''قدرت اللہ شہاب'' مختصر اور دلکش انداز میں لکھا گیا خاکہ ہے جس سے شہاب کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے۔

''اشفاق احمد'' فنکارانہ انداز میں لکھا گیا خاکہ ہے جو خاکہ نگاری کی مشاقی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ''سونا اور تانبے'' کا استعارہ اشفاق احمد سے موسوم ہے۔ اس خاکے میں اے حمید اپنے درشن بھی خوب کراتے ہیں۔

''سیّد عبدالحمید عدم'' ایک خوبصورت خاکہ ہے۔ عدم آشنائی کے لیے یہ عمدہ تحریر ہے۔ دیگر محاسن کے ساتھ بادہ خواری کے قرینے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

''چراغ حسن حسرت'' سے متعلق تحریر خاکہ تو درکنار مضمون بھی نہیں۔ اس میں حسرت سے متعلق کوئی قابل ذکر بات نہیں صرف اخباری کالم کا پیٹ بھرنے کے لیے حسرت کی تصنیف ''مردم دیدہ'' کے چند اہم خاکوں کے اقتباسات کو پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ تحریر خاکوں کے مجموعے کا حصہ بنائے جانے کی قطعی لائق نہیں ہے۔

اے حمید نے چند یادوں کی پرچھائیوں کو ترتیب دے کر ''انشاء جی'' جیسا مؤثر خاکہ تخلیق کیا ہے جس میں ان کے خطوط اور تصنیف ''چینی نظمیں'' کے ابتدائیے سے ایک

اقتباس بھی شامل ہے۔ یہ عمل فن خاکہ نگاری میں بدعت کے مترادف ہے لیکن یہاں بدعت حسنہ تصور کیا جائے گا کیونکہ یہ حوالے شخصیت کے باریک نقوش کو بھی سامنے لائے ہیں۔

''صوفی غلام مصطفیٰ تبسم'' میں ان کے معمولات و مشاغل سے دلکش خاکہ کشید کیا گیا ہے۔

''سیف الدین سیف'' کا ابتدائیہ ہی اس کے تعزیتی مضمون کا سائن بورڈ ہے۔ اس مضمون میں سیف کی مدھم سی تصویر ضرور ابھری ہے لیکن قاری شخصیت سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہو پاتا۔ اس کے علاوہ فن پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سیف سے متعلق اے حمید کی یادیں خاکے کا روپ دھارنے سے قاصر رہی ہیں اور قدم تعزیتی مضمون سے آگے بڑھا نہیں پائیں۔

''اخلاق احمد دہلوی'' عادتوں، طور طریقوں اور رویوں کے رنگوں سے بنائی گئی خوش نما تصویر ہے جو تعزیت نامہ ہونے کے باوجود خاکے کا مکمل روپ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس میں موت پر لکھی گئی تحریر جیسی جذباتیت نہیں بلکہ شخص کو پورے وجود کے ساتھ سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اخلاق احمد دہلوی کی یادداشتوں کے اقتباسات کو خاکے کا حصہ بنانے کے خوش گوار تجربہ نے تصویر کے اسقام کو دور کر دیا ہے۔

''قتیل شفائی'' سے متعلق یادوں میں قتیل کے محاسن و معائب پر روشنی زیادہ نہیں پڑتی۔ یادوں میں کھونے کے بجائے شخصیت پر توجہ مرکوز رکھی جانی چاہیے تھی۔ اس تحریر میں خاکے کا ہلکا سا ذائقہ تو ہے لیکن مکمل خاکہ ہرگز نہیں ہے۔ شخصیت سے متعلق دو چار باتوں سے خاکہ تشکیل نہیں پاتا۔ ایک ایک روپ اور ایک ایک ادا سے آشنائی کرانا ہوتی ہے۔

''ساغر صدیقی'' مختصر مگر جامع خاکہ ہے جس میں نوحہ گری کا سارنگ ہے۔

''ساحر لدھیانوی'' ۳۲ صفحات پر مشتمل طویل ترین تحریر ہے جس میں ساحر کی شخصیت پر مواد کم ہے واقعات کو طول زیادہ دیا گیا ہے۔ اس سے کہیں بہتر اور جامع خاکے حافظ لدھیانوی اور بعض دوسروں نے لکھے ہیں۔ اس کے باوجود دیگر تمام شخصی تحریروں کی

kitaabiyat.blogspot.com

طرح اس میں بھی قاری کو جکڑنے کی صفت موجود ہے۔ اس مضمون سے ہمیں ساحر کے شرمیلے پن، حساسیت، جرأت و حوصلے کی کمی اور کسی کو تکلیف میں دیکھ کر خود کرب میں مبتلا ہونے کے اوصاف سے آگہی ہوتی ہے۔ اے حمید گرچہ ہر خاکے میں ضمنی کرداروں کا تعارف کراتے ہیں لیکن ساحر لدھیانوی کے شخصیت نامے میں قتیل شفائی کے فن کے حوالے سے سطور کچھ بھلی نہیں لگتیں اس لیے کہ قتیل کا الگ خاکہ موجود ہے۔

''شمس آغا'' خوبصورت و دلنشیں مضمون ہے جس میں خاکے کی مہک ہے۔ اے حمید کی ممدوح سے کوئی ملاقات نہیں کہ وہ عادات و اطوار اور رویوں سے واقف ہوتے۔ انہوں نے مختلف تذکروں سے فنکارانہ مہارت کے ساتھ شمس آغا کا شخصیت نامہ تیار کیا ہے جو خاکے کی حدود سے باہر ہے۔

''سیّد ضمیر جعفری'' میں ممدوح دو چار سطروں کے بعد عنقا ہے۔ ساری کتھا کہانی اے حمید کی اپنی ہے اس لیے یہ تحریر ضمیر جعفری سے متعلق نہ تو مضمون ہے اور نہ ہی خاکہ۔ اسے خاکوں کے مجموعے میں شامل کرنا ترتیب و تدوین میں غفلت کا غماز ہے۔

''باری علیگ'' ایسا مضمون ہے جس میں رنگون کا سفر، روزنامہ ''احسان'' اور باری سے متعلق چند یادیں ہیں۔ اس کے علاوہ باری کی تصنیف ''تاریخ کا مطالعہ'' پر تبصرہ ہے۔ فاضل خاکہ نگار کی باری سے چند سرسری ملاقاتیں ہیں۔ اس لیے وہ اپنے ممدوح کی شخصیت میں ایک شفیق و وضعدار بزرگ سے زیادہ کچھ اور دریافت نہیں کر پائے۔ بقول ان کے اپنے:

''نہ تو میں ان کا ہم عمر اور دوست تھا کہ ان کی زندگی کے بعض
پوشیدہ پہلو اجاگر کرتا.....'' (ص: ۳۱۸)

بہر حال یہ مضمون بھی خاکے سے کوسوں دور ہے۔

''ڈاکٹر عبادت بریلوی'' منفرد انداز میں لکھا گیا خاکہ ہے جو ممدوح کے مزاج اور اطوار کا بھرپور عکاس ہے۔ مکالمے بولتی اور متحرک تصویر پیش کرتے ہیں۔ پورا خاکہ ہی کسی ویڈیو فلم کے مترادف ہے۔ چڑیا کا استعارہ خاکے کو نکھارتا ہے۔

''سیّد وقار عظیم'' نہایت عمدہ خاکہ ہے۔ شخصیت کے تمام اسرار و رموز سے واقفیت ہوتی ہے۔ قاری وقار عظیم کو اپنی نظروں کے سامنے بالکل اسی انداز میں بولتے چالتے اور کام کرتے محسوس کرتا ہے جیسے وہ حقیقی زندگی میں تھے۔

''ابراہیم جلیس'' ملاقاتوں اور رفاقتوں کی روشنی میں ایسا شخصیت نامہ ہے جس میں ممدوح کی بذلہ سنجی، جملے بازی اور خوش فکری کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔ احباب کی شرارتوں اور مکالموں میں ابراہیم جلیس کی شخصیت دب سی گئی ہے۔ یہ مضمون خاکے کے ذائقے کے باوجود شخصیت کی دوسری پرتیں نہ کھلنے کے سبب خاکہ قرار نہیں پا سکتا۔

''احمد راہی'' کے بیشتر مندرجات دوسرے شخصیوں میں بھی ہیں۔ اس مضمون میں سارا زور مقامات اور ماحول کی جزئیات نگاری اور منظر کشی پر صرف کیا گیا ہے۔ احمد راہی سے متعلق یادوں سے سگریٹ نوشی، شاعری، گالم گلوچ اور دوست نوازی کے اوصاف سے متصف ایک نوجوان کا ہیولا ابھرتا ہے جب کہ خاکہ نگار اور ممدوح کا عمر بھر کا ساتھ رہا اس کے باوجود نوعمری کی نقش گری تک محدود رہنا عجیب سا لگتا ہے۔ گرچہ بعد کا بھی تذکرہ ہے مگر غیر مؤثر۔ مضمون کے سوانحی انداز پر اعتراض نہیں، صحیح اور مکمل تصویر تو ابھرنی چاہیے۔

''انور جلال شمزا'' ایسی تحریر ہے جو خاکے سے بہت فاصلے پر ہے۔ یادوں کی پرچھائیوں میں سے شمزا کی نہایت دھندلی تصویر سامنے آئی ہے۔ ممدوح پر مقامات، شخصیات، مناظر اور باتوں کے پردے تن گئے ہیں۔ صرف ایک خوش ذوق اور شائستہ آرٹسٹ کا سراغ ملتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ آگہی نہیں ہوتی۔ اگر خاکہ نویس بار بار بھٹکنے کے بجائے یہ ذہن میں رکھتے کہ وہ شمزا کا خاکہ لکھ رہے ہیں تو ممدوح کی صحیح اور مکمل تصویر پیش کر پاتے۔ بھٹکنے کی عادت نے ان کی تحریر کو خاکے سے کہیں دور لے جا پھینکا ہے۔

''راجہ مہدی علی خاں'' سے صرف یہی معلوم ہو سکا ہے کہ وہ فربہ جسم کے مالک اور جملے باز تھے۔ یہ مضمون پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اے حمید نے خاکہ لکھنے کی شعوری کوشش نہیں کی بلکہ قلم کو یادوں کے بہاؤ پر چھوڑ دیا جو خاکہ نویس کی آوارہ گردیوں کے وسیع و عریض

kitaabiyat.blogspot.com

میدانوں کو عبور کرنے لگا اور یوں زیرِ نظر شخصیت اوجھل ہو گئی۔

''شبنم شکیل'' بھی ممدوح کے فن پر مختلف مشاہیر کی آراء سے مزین مضمون ہے جس کا خاکے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

''مرزا سلطان بیگ'' نہایت عمدہ خاکہ ہے جس میں اے حمید حیرت انگیز طور پر شخصیت تک محدود رہے ہیں۔ حسبِ عادت چائے کی خوشبو، پھولوں کی مہک، درختوں کا سحر، گلیوں، کوچوں، سڑکوں، بازاروں، دکانوں، اور عمارتوں کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوئے۔ یعنی یہ ان کی رومانویت سے پاک خاکہ ہے۔ سادہ و دلچسپ انداز میں مرزا سلطان بیگ کی پوری شخصیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔

''شفیع عقیل'' سے متعلق مضمون میں موصوف کے فن، کراچی کے سفر کی تفصیل اور کچھ یادیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیف ''سیف الملوک'' کے دیباچے کا طویل اقتباس بھی منقول ہے۔ جس سے شفیع عقیل کی شخصیت مترشح نہیں ہوتی۔ یہ تحریر بھی ان چند میں سے ایک ہے جنہیں خاکوں کے مجموعے کا حصہ بنانا کتاب سے زیادتی کے مترادف ہے۔

''نوازا'' ایک کامیاب خاکہ ہے جس میں اے حمید ممدوح کو قاری کے روبرو لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ قاری اس سے ملاقات کرتا ہے اس کی حرکات و عمل کا جائزہ لیتا ہے، اس کی قربت سے فرحت محسوس کرتا ہے۔ خاکے کا اختتام توقع کے برخلاف، المیہ ہے۔ پورے خاکے میں زندہ شخص کا تصور موجود ہے جبکہ آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیماری کا مقابلہ کرتے کرتے اس دنیا سے کوچ کر چکا ہے۔

''شرقی بن شائق'' ایسا مضمون ہے جس کے قدم خاکے کی جانب بڑھتے بڑھتے راستہ بدل لیتے ہیں۔ یہ مضمون شرقی کے فن پر خاکہ نگار اور مشاہیر کی آراء سے مزین ہے تاہم شخصیت سے متعلق جتنی سطور ہیں ان سے شرقی کی تصویر ضرور ابھرتی ہے۔

''کلیم اختر'' ایسا مضمون ہے جس میں خاکے کا برائے نام ذائقہ ہے۔ کیونکہ سارے تذکرے میں کلیم اختر کی ذات منکشف نہیں ہو رہی۔ فن اور شخصیت خلط ملط ہو رہے ہیں۔ اے حمید کی روایتی رومانویت بھی نکتۂ عروج پر ہے بلکہ حد سے زیادہ پاؤں پھیلائے ہوئے ہے۔ سیالکوٹ کے طویل تذکرے اور چائے کے قصیدے نے اکتاہٹ کی کیفیت کو جنم دیا ہے۔

''صلاح الدین محمود'' سے متعلق مضمون بھی ملغوبہ سا ہے۔ پہلے ہم ممدوحِ اصل کے وسیلے سے اسحاق میر سے متعارف ہوتے ہیں پھر پاک ٹی ہاؤس کی یادوں سے ہوتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں جس میں صلاح الدین محمود کا بہت اچھا تعارف کرایا گیا ہے پھر سرسیّد سے متعلق ان کی تحریر کے طویل اقتباس اور نظم ''ترانہ اصیل'' کے بعد پاک ٹی ہاؤس کی یادوں میں ایک بار پھر دھکیل دیئے جاتے ہیں یوں اصل موضوع گم ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اے حمید نے ماضی کے مرغزاروں میں بھٹکنے کے لیے صلاح الدین محمود کو وسیلہ بنایا ہے۔ ان کا خاکہ لکھنا مقصود نہیں تھا۔

اے حمید بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں جس کی وجہ سے خاکہ بھی افسانے کے رنگ میں لکھتے ہیں۔ افسانے کی تیکنیک کو بروئے کار لاتے ہیں۔ شخصیت کے ہر واقعے کو افسانے کی سی دلکشی اور رعنائی عطا کرتے ہیں۔ منظر نگاری اور ماحول نگاری ان کے خاکوں کا لازمہ ہے۔ ان کے افسانوں کی طرح خاکے بھی درختوں، پتوں، شاخوں، پھولوں، خوشبوؤں، پرندوں، ہواؤں اور موسموں کی لطافتوں کے اذکار سے آراستہ ہیں۔ ان کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا خاکہ نگار ایسا ہو کہ جس کے ہاں اتنی کثرت سے مناظرِ فطرت کی عکاسی سے کی گئی ہو۔ فطرت کا حسن ان کی ذات میں اتنا رچ بس گیا ہے جس کا اظہار ایک قدرتی امر ہے۔

اے حمید کے خاکوں پر ناسٹلجیا کا عنصر بری طرح چھایا ہوا ہے۔ تقریباً ہر خاکے میں آبائی وطن امرتسر کی یادیں جزئیات کے ساتھ آ موجود ہوتی ہیں۔ وہ جہاں جاتے ہیں امرتسر یاد آ جاتا ہے۔ ہر ماحول کو امرتسر کے آئینے میں دیکھنے کے عادی ہیں یا یوں کہا جائے کہ وہ بہانے بہانے سے امرتسر کو یاد کرتے ہیں۔ یادِ وطن کے حوالے سے وہ کسی طور پر ناصر کاظمی سے پیچھے نہیں ہیں۔

اے حمید کے خاکوں میں ماضی پرستی کا بہت عمل دخل ہے۔ ماضی میں کھونا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ بیتے لمحات ان کی زندگی کا اثاثہ ہیں جنہیں وہ سینت سینت کر رکھتے ہیں اور ہر ایک کے سامنے صندوق کھول کر ذوق وشوق کے ساتھ ایک ایک یاد کا دیدار کراتے ہیں۔ کوئی درخت، کوئی پودا، کوئی سڑک، کوئی گلی، کوئی جگہ دیکھتے ہیں تو جھٹ ان کا ذہن اس سے وابستہ یاد کی دلکشی میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔

اے حمید کے خاکے جہاں شگفتگی و رعنائی کے مظہر ہیں وہاں کہیں کہیں وہ فکر انگیزی کا تڑکا بھی لگا جاتے ہیں۔ ان کا روشنی بخش اور عطر بیز جملہ انسانی روح کو جھنجوڑنے کے ساتھ سرشاری بھی عطا کرتا ہے۔

''عبادت صاحب کے چہرے پر عمر نے اپنے اثرات بہت ہی
کم چھوڑے ہیں۔ شاید یہ اس سرخ چڑیا کا کرشمہ ہے جو ان
کے ساتھ اڑا کرتی ہے کیونکہ میں نے کسی چڑیا کو بوڑھی ہوتے
نہیں دیکھا اور جب تک ایک آدمی کے سر پر چڑیا کا سایہ ہے
وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔'' (ص:۳۳۳)

چائے کو جتنی اہمیت اے حمید کے خاکوں میں ملی ہے کسی اور کے ہاں نظر نہیں آتی۔ چائے کا ذکر آتے ہی وہ مچل مچل جاتے ہیں اور قصیدہ خوانی کرنے لگتے ہیں۔ چائے کے رنگ، خوشبو اور ذائقے میں مست ہو جاتے ہیں۔ چائے ان کی شخصیت کا جزو اعظم لگتی ہے۔ جو ان کے حواسوں پر چھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے خاکے کو چائے کے رنگ میں رنگا، مہکایا اور لذت آشنا بنایا ہے۔ یہ انفرادیت صرف انہیں ہی حاصل ہے۔

عمدہ، دل نشیں اور نادر تشبیہات اے حمید کے خاکوں کو اُجالتی ہیں۔ گھنی بیل کی کاٹ چھانٹ کے عمل کو ''کسی پاگل بہی کی خشخاشی'' سے تعبیر کرتے ہیں تو تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ پروفیسر وقار عظیم کی خاموشی کے حوالے سے یہ عبارت بھی فرحت بخش ہے:

''وقار صاحب کی خاموشی کنجِ چمن کی خاموشی تھی کہ جہاں ایک

آدھ بار کوئی چڑیا ضرور بول جاتی تھی۔ ہلکی پھلکی گرتی برف
کے ریشمی گالوں ایسی خاموشی تھی ان کی، جیسی آپ کہر آلود
شام میں کسی آتش دان کے پاس بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔
ان کی خاموشی سے لائبریری کی خاموشی کا خیال آتا تھا جیسے کسی
آبنوسی میز پر چائے کی پیالی کے پاس شعر کی کوئی کتاب بند
پڑی ہو۔'' (ص:۳۵۷)

اے حمید کے خاکوں کا آشیانہ یادوں کے تنکوں سے تشکیل پایا ہے اس لیے ان یادوں کے تمام چھوٹے بڑے کرداروں کے رویوں سے بھی آشنائی کا موقع ملتا ہے۔ یہ کردار زیادہ تر اردو ادب کی اہم شخصیات ہیں اس لیے تاریخی اعتبار سے ان کی اپنی اہمیت ہے۔

خاکہ نگاری میں حوالوں کی تکنیک مستحسن عمل نہیں لیکن اے حمید کے اکا دکا خاکوں میں یہ اتنے برمحل ہیں کہ خاکوں کا جزو محسوس ہوتے ہیں اور انہیں نکھارنے کا سبب بنتے ہیں۔ ممدوح کی تحریر سے اقتباس کا تجربہ اخلاق احمد دہلوی کے خاکے میں نظر آتا ہے جبکہ حفیظ جالندھری کے خاکے میں ان کی شخصیت کی پرت کھولنے کے لیے گوپال متل کی کتاب سے اقتباس کا سہارا لیا گیا ہے۔ گرچہ اے حمید اس روش پر زیادہ نہیں چلے لیکن خاکہ میں اس عنصر کی موجودگی ناقدین فن کی بھنویں سکیڑنے کا سبب ضرور بنے گی۔

اے حمید کے خاکے ان کی وسعت مطالعہ اور عالمی ادب پر گہری نظر کے عکاس ہیں۔ شخصیات، مقامات اور فن کے حوالے سے ان کے قلم سے نکلی ہوئی بے ساختہ تشبیہات اس وصف کا پتہ دیتی ہیں۔ نواز کو کپلنگ کے کردار ''مگم'' سے تشبیہ دینا اور ایبٹ روڈ پر واقع اجڑی ہوئی سرخ عمارت کو آرتھر کانن ڈائیل اور ایڈگر ایلن پو کی پراسرار کہانیوں سے مشابہ قرار دینا اس ضمن میں اہم مثالیں ہیں۔

کسی تحریر کا عمدہ آغاز اور اختتام قاری پر گہرا اثر مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ تحریر کو بھی وقیع بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اے حمید اپنے خاکوں میں اس معیار پر پورے

kitaabiyat.blogspot.com

اترتے ہیں۔ ان کا ابتدائیہ جاذبیت، افسانویت اور بے ساختگی کا مظہر ہوتا ہے جب کہ اختتامیہ بھی اپنی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ناصر کاظمی اور قدرت اللہ شہاب کے خاکے بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اے حمید حلیہ نگاری میں بھی مشاق ہیں۔ اس ضمن میں وہ طوالت، ادبیت اور رنگینیٔ عبارت کے قائل نہیں بلکہ دل نشیں پیرائے میں شخصیت کے خدوخال اختصار سے بیان کرتے ہیں کہ تصویر دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ سید وقار عظیم کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''ماضی کے دھندلکے میں ایک اچکن پوش دبلی پتلی دلکش
شخصیت کو دیکھتا ہوں کہ ایک لمبا مفلر کندھوں سے ہو کر آگے
سینے پر پڑا ہے۔ تنگ موری کا سفید پاجامہ ہے اور سانولے
چہرے پر دل آویز من موہنی مسکراہٹ ہے اور آنکھوں میں
ذہانت کی چمک ہے۔ بال گہرے سیاہ اور لہریالے ہیں۔ چال
میں ایک متانت اور وقار ہے۔ بات کرتے وقت چہرہ مسکراتا
رہتا ہے۔ آواز بھاری اور لہجہ شیریں ہے۔ سبک روندی کی
طرہ دھیمے بول رہے ہیں۔ بولتے میں نظر سامنے ہے۔ چہرے
پر اظہار کا بھرپور تاثر ہے۔ بات ختم ہوتی ہے تو چہرے پر
خاموش مسکراہٹ ہے۔''

خاکہ نگار پر لازم ہے کہ وہ زیر نظر شخصیت سے تعلق کی آڑ میں اپنا تعارف شروع نہ کر دے۔ ہمارے بڑے بڑے ادیب اس عیب سے نہیں بچ سکے۔ بعض تو اتنے خود پرست واقع ہوئے ہیں کہ ممدوح سے متعلق سطور پر ان کی اپنی تشہیری مہم کا گمان ہوتا ہے۔ اب رہ گئی بات اے حمید کی..... تو وہ بھی خاکوں میں غیر محسوس طریقے سے اپنی عادات و اطوار اور معاملات کو متعارف کراتے ہیں جن کی ترتیب و تدوین سے ان کا اپنا اچھا سا خاکہ سامنے آ سکتا ہے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ذات شناسی کا سلسلہ صفحات پر پھیل گیا ہے یا خود

نمائی و خود آرائی کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ تو نظروں کو چبھنے لگا ہے۔

اے حمید کے خاکوں میں کہیں کہیں پنجابی الفاظ اور روزمروں کی آمیزش بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو روزمرے کا غلط استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

''جس کو میں اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں فوراً اس کے ساتھ
محبت ڈال لیتا ہوں۔ اشفاق احمد کے ساتھ بھی پہلے ہی دن
سے میں نے محبت ڈال لی تھی۔'' (ص:۱۳۴)

ان کی نثر کے دانستہ اختیار کردہ یہ عیوب برائے نام ہیں۔ ہزاروں سطور میں چند فروگذاشتوں یا تجربوں کی اجازت ہونی چاہیے۔

یہ بات طے ہے کہ اے حمید کے زیادہ تر خاکے محبت و الفت کے مظہر ہیں۔ انہوں نے شخصیات کو نفرت کی نہیں، محبوبیت کی نظر سے دیکھا ہے۔ انہوں نے ایک مشاق مصور کی طرح ہو بہو تصویریں پینٹ کی ہیں۔ ان کی تصویریں چلتی، پھرتی اور بولتی دکھائی دیتی ہیں۔ قاری کو قطعاً یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ جن کے بارے میں پڑھ رہا ہے وہ اس دنیا میں نہیں ہیں یا پھر کوسوں دور بیٹھے ہیں۔ وہ خود کو ان کے قرب و جوار میں محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلوب کی انفرادیت نے اے حمید کے خاکوں کو الگ شان عطا کی ہے اور انہیں اہم خاکہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

❁❁❁❁

kitaabiyat.blogspot.com

ابوالفضل صدیقی

ابوالفضل صدیقی، فکشن کا ایک ممتاز و منفرد نام اور ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ناول و افسانے کے حوالے سے ان کی تیرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''عہد ساز لوگ'' ان کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ۳۳۵ صفحات پر مشتمل کتاب میں صرف سات افراد کے 'خاکے' ہیں۔

''پہلی کرسی'' سلطان حیدر جوش کا 'خاکہ' ہے جس سے جوش کی شخصیت، مزاج، خوبیوں اور خامیوں سے مناسب حد تک آگہی ہوتی ہے۔ اس کے مطالعے سے جوش کی واضح تصویر ابھرتی ہے تاہم پریم چند کے حوالے سے جوش کی طویل ترین گفتگو غیر ضروری ہے۔ اسی طرح جوش کا خاندانی پس منظر بھی اکتا دینے والا عمل ہے۔ ان کے بیٹے احسان حیدر کا تفصیلی ذکر الگ خاکے کی ضرورت کو ابھارتا ہے۔

''خالی کرسی'' عقیدت کے شیرے میں ڈوبا ہوا مولانا صلاح الدین احمد کا شخصیہ ہے جس کی تمہید ہی بیزار کر دینے والی ہے جا بجا تکرار و اعادہ اور غیر ضروری طوالت نے 'خاکے' کو بوجھل کیا ہے۔ سکھوں کے حوالے سے طویل مکالمہ قطعی غیر ضروری ہے کیونکہ اس سے مولانا کی ذات کا کوئی پہلو مترشح نہیں ہوتا۔ رہا مولانا کی علمی وجاہت کا سوال، تو اس سے کس کم بخت کو انکار ہے۔

''خوف'' شاہد احمد دہلوی کی کھٹی میٹھی شخصیت سے متعلق تحریر ہے۔ جس میں فن پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ شخصی محاسن کو بھی فن ہی سے کشید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تمہیدی سات صفحات غیر ضروری ہیں جن میں خاکہ نگار کی اپنی ذات کی عکاسی اور دیگر موضوعات پر خامہ فرسائی ہے۔ یہیں پر بس نہیں کیا گیا، آگے چل کر روہیل کھنڈ کی معاشرت، دہلی کے حکماء و رؤسا کے طور طریقوں پر ساڑھے تین صفحات صرف کر دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک آدھ

جملے میں کہی جانے والی بات کو دسیوں سطروں تک پھیلا دیا گیا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد کا بار بار تفصیلی ذکر بھی خاکے کو بری طرح چھیل رہا ہے۔ موضوعات کی تکرار، وقفوں وقفوں سے اپنی ذات کے بارے میں آگہی بخشنے اور طولِ بیانی کے عمل نے خاکے کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اگر کاٹ چھانٹ کر دی جائے تو بہت مختصر مگر سمارٹ خاکہ برآمد ہوگا۔

''ڈاکٹر عندلیب شادانی'' شخصیت کی گہرائی میں اتر کر لکھا گیا خاکہ ہے جس کے سبب شادانی کی ذات کے تمام گوشے اجاگر ہوئے ہیں۔ دورانِ مطالعہ ان کی مکمل و متحرک تصویر سامنے آتی ہے۔ معمولات کے بیان نے خاکے کی شان بڑھا دی ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود ابوالفضل صدیقی کی تحریر کے عیوب اسی آب و تاب سے ہیں۔ چھ صفحات پر مشتمل تمہید نامناسب ہے اگر ذکر مقصود تھا تو نہایت اختصار سے کیا جا سکتا تھا۔ بلاوجہ طول دیا گیا۔ اسی طرح آخری تین صفحات بھی غیر متعلق ہیں۔

''من و تو'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے معمولات، مشاغل، گھریلو امور اور دفتری ذمہ داریوں کے ذریعہ شخصیت کو ٹٹولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ طولِ بیانی، غیر ضروری مندرجات، صفحات کے صفحات میں خودنمائی اور بار بار بھٹکنے کے عمل نے نہ صرف بے کیفی کو جنم دیا ہے بلکہ خاکے کو سخت مضروب کیا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ تحریر خاکے کی حدود کو پھلانگ کے سوانحی مضمون تک جا پہنچی ہے۔

''من انداز قدرت را'' ضیاء جالندھری سے متعلق تحریر ہے اس میں حسب روایت مرکزی شخصیت سے بار بار بھٹکنا شعار رہا۔ اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے جنون نے یہاں بھی خوب رنگ دکھایا۔ فن پر بھی اظہار خیال ہے۔ ۱۶ صفحات میں سے کم از کم تیرہ صفحات کا مواد قطعی غیر ضروری ہے۔ اختصار و جامعیت کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تو مؤثر خاکہ قرار پا سکتا تھا۔

''منشی جی فیض اللہ'' جارحانہ تحریر ہے جس میں شخصیت کے ایک رخ، جبر، کو سامنے لایا گیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ منشی جی میں خوبیاں نہ ہوں۔ اپنی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اتنا تلخ 'خاکہ'' لکھنا خاکہ نگار کی زخم خوردگی کا مظہر اور جذبۂ انتقام کے تاثر کو ابھارتا

kitaboiyat.blogspot.com

ہے کیونکہ باقی تمام شخصیے شہد کی مٹھاس لیے ہوئے ہیں۔ اگر محاسن شامل ہوتے تو یہ معرکتہ الآرا خاکہ ہوسکتا تھا۔ اس کے باوجود ابلاغ اور مواد کے لحاظ سے باقی تمام شخصیت ناموں سے بہتر اور دلچسپی کا عنصر زیادہ ہے۔

ابوالفضل صدیقی کے شخصیوں میں حلیہ نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ وہ روایتی انداز میں تعارف نہیں کراتے بلکہ منفرد اسلوب میں نقشہ کھینچتے ہیں۔ ضیاء جالندھری کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں:

''ٹھیک ٹھیک ٹکسالی زبان میں جسے کہتے ہیں ''دھان پان سا'' بس جیسے وہی۔ نم نم گلابی گلابی ذرا گداز سے ہونٹ جن کی تشریح میر تقی میر بہت دنوں پہلے کر گئے ہیں اور انہی کے رنگ کے مطابق بیضوی مائل چہرہ، سنہرے سنہرے رخساروں پر ہلکی ہلکی شفق کھیل رہی تھی۔ ہاتھی دانت کی طرح چمکدار بلند پیشانی، خوب گھنے سیال بال، آنکھوں میں گہرے غور و خوض کی نشانیاں چھلکی ہوئی۔ ناک جیسے طوطے کی چونچ جس کے نیچے سبزہ آغاز سی چھدری چھدری نرم نرم خوب چوڑی مونچھیں جو ابھی رونگٹے اور بال کے بین بین تھیں اور ایسی نظر آتی تھیں کہ ہنوز قینچی استرے کی دسترس سے محفوظ رہی ہیں اور کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ شاید چہرہ مہرہ، رنگ روپ اور قد و قامت اور سرکاری عہدے کے زیرِ نظر کم سنی کی غمازی پر پردہ ڈالنے کے لیے خاص اہتمام سے رکھائی ہوئی ہیں۔

روپہلے چمکدار بٹنوں والا سبز کائی بلیزر کا کوٹ، صندلی مائل شتری رنگ کے فلالین کی پتلون، پاؤں میں سیاہ و سفید چمڑے کا جوتا، سبز تُسری کا موزا اور سفید و سبز ترچھی پٹیوں والی ٹائی، سب کچھ نہایت ٹپ ٹاپ ستھری طالب علمانہ سی وضع۔

یہ تھے میاں اس گھڑی جب میں نے انہیں دہلی ریڈیو کے ایک مخصوص کمرے میں پہلی مرتبہ اعجاز بٹالوی کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔''

ابوالفضل صدیقی کا اسلوب بیان قدماء کا سا رنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ عبارت پڑھ کر سرسیّد احمد خاں کی نثر یاد آجاتی ہے۔

''راقم الحروف کو تو اپنی فکر و استعداد اور خوش قسمتی کے تھوڑے سے قرب کے طفیل جوش صاحب کی زندگی کے متعلق کچھ تحریر کرنا ہے۔ سنا ہے، انہوں نے جیسا کہ نوجوانوں کی گلے بازی کا تقاضا ہوتا ہے، گنگناہٹ سے شاعری کا کیریر شروع کرنا چاہا، جو نوخیزی سے شروع ہو کر جوانی تک پہنچتے پہنچتے بے چاری آپوں آپ چپ لگا جاتی ہے اور آدمی آگے آجاتا ہے، شاعری پیچھے رہ جاتی ہے مگر جوش کے اندر سچا فنکار بیٹھا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ ''پکا شیخ'' بھی۔۔۔۔۔'' (ص:۸)

اس کے باوجود بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ سامنے بیٹھے شخص سے باتیں کرنے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کا یہ انداز قاری کے لیے باعثِ کشش ہوتا ہے۔

ابوالفضل صدیقی نے اپنے شخصیوں میں ٹھیٹھ روزمروں اور محاوروں کا ایک بڑا خزانہ دیا ہے جو آج کے دور میں نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی الگ لغت مرتب ہوسکتی ہے۔ کلاسیکی چٹخارے کے حامل چند روزمرے و محاورے پیشِ خدمت ہیں۔ چچھور، کنسرانہ، پھگوڑیات، کٹھ بگڑوں، ربڑ کے بوئے، رات کھسے اچھلوں، ڈوبوں نیند آنا، خوف کا کابوس، پچھیت سے دھوک لگائے، ہاچ پاچ قسم کی، نُخ نُخ سفارشی گدھوں، چکنی چکوے والے ہزار میل کی دوری، سوتیا ڈاہ کا بھوت ستانے لگا، سُوت کے بھاگ جاگے، سوتا پڑے تک، لیے کا پھندا تو دیئے ہی سے کٹے گا، پنکشی ڈرتا ہے، چل چلاہٹ سی مچ گئی، ہلکی سی بت بتاہٹ ہونا، ٹکوہ کھجلا پڑنا، برادری بھر میں گرٹ چل گئی، ذرا سور تے نکلتا ہو جاتا ہے، پھنا جھاڑ کر، ساونٹھے ہوگئے، پیزاروں پیام دکھائی

kitaabiyat.blogspot.com

پڑنا، ساتویں فاقہ کتا حلال والا بھوکا ہے۔ یہ سب محاورے آج متروک سے لگتے ہیں۔

تشبیہات افسانے کا سنگھار ہوتی ہیں اور جب کوئی افسانہ نگار خاکہ لکھے گا تو وہ فطری طور پر اس تیکنیک کو بروئے کار لائے گا۔ یہی ابوالفضل صدیقی نے بھی کیا۔ انہوں نے عبارت کی آرائش کے لیے عمدہ تشبیہات کا سہارا لیا۔ چند مثالیں دیکھیے:

''ان کی یہ نشست بھادوں کی اماوس کا کوندا ہوتی۔'' (ص:۹۰)

''اس ماحول میں صاحب بہادر کے کمپلیکس کی کچھ وہ شکل ہوگئی جو سگ گزیدہ کے خون کے اندر ہائیڈروفوبیا کے زہر کی ہوا کرتی ہے۔'' (ص:۱۳۵)

''عدالت کے مشخص حاکم مال کی کمرے میں کرسی شکر کی پوٹ سے بھری ہوئی ہے جہاں اور جگہ بالعموم حنظل کے پھل بھرے نظر آتے ہیں ورنہ ایلوے کے تودے رکھے ہوتے ہیں۔ فرائض منصبی انجام دیتے وقت عام کرسیوں پر سے مرچوں کے سفوف اور کونین کے پاؤڈر کے بخارے اڑا کرتے ہیں، یہاں ہونٹوں سے دودھ شہد کے فوارے اچھلتے ہیں۔'' (ص:۲۱۹)

ابوالفضل صدیقی کی شخصی تحریروں میں جزئیات نگاری کا اہتمام نظر آتا ہے۔ وہ واقعات، ماحول اور مناظر کی ذرا ذرا سی تفصیل سے آگاہ کرنا اپنا فرضِ منصبی خیال کرتے ہیں۔ کہیں یہ تفصیل اکتاہٹ و بیزاری کو جنم دیتی ہے اور کہیں دلچسپی کا سامان پیدا کرتی ہے۔ مؤخرالذکر کی ایک مثال ''من وتو'' میں شرافت خلیفہ کا کردار ہے جس کی شیریں گفتگو اور بال تراشنے کے عمل کی تفصیل قاری کو جکڑتی ہے اس طرح ڈاکٹر شادانی کے خاکہ میں بھیم تال کی منظر کشی بھی عمدگی سے کی گئی ہے۔

ابوالفضل گلے شکوے بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں زود رنجی کی بجائے محبت و اخلاص جھلک رہا ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثالیں جمیل جالبی اور ضیاء جالندھری کے شخصیت ناموں میں کئی بار ملتی ہیں۔

''میرے اور موصوف کے روابط ہر ملاقات میں میرے دل کے اندر مضبوط تر ہوتے گئے۔ ان کے دل کا حال خدا جانے۔ مجھے تو آج تک صفحہ سپاٹ لگتا ہے۔ بہرحال کئی ذہنی اشتراکوں اور مشترکہ قدروں کے طفیل اچھی نبھ رہی ہے بلکہ اب تو برسوں سے گاڑھی چھن رہی ہے اور دیکھنے والوں کا اندازہ ہے کہ چھن چھن کے تھوڑی بہت ان کے دل میں بھی اتر رہی ہے ویسے ہمیں تو کوئی خاص آثار نظر نہیں آئے خدا ہماری تسلیم کی خو اور ان کی بے نیازی کا بھرم بنائے رکھے اور وعدہ کی بے اعتباری کا اعتبار قائم رکھے۔'' (ص:۳۰۵)

ابوالفضل صدیقی کے شخصیت ناموں کا ماحول گرچہ سنجیدہ ہے لیکن کئی مقامات پر یہ شگفتگی میں بدل جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور منشی جی فیض اللہ کے شخصیے ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی لیے ہوئے ہیں:

''ایک صبح لارڈ بائرن سو کر جو اٹھا تو لارڈ سے ''مشہور'' بھی ہو گیا تھا اور اپنے اچھے خاصے محمد جمیل خاں مشہور تو تھے ہی رات کو اچھے خاصے سوئے صبح جو نکلی تو ڈاکٹر محمد جمیل خاں ہو گئے اور جب مجھے شمیم احمد نے یہ خبر سنائی کہ ''حضرت گنج مخفی'' بھی نکلے تو مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا اور یہ بھی کہ حیدرآباد اس سلسلہ میں تشریف آوری ہوئی تھی اور کئی ملاقاتیں ہوئیں یہ بتا کر نہ گئے تھے کہ آدمی سے ڈاکٹر بننے آیا تھا' بہرحال یہ بھی بننے والی سردی اور گہرائی کی انتہا تھی اور اس راستہ سردست تو مٹھائی کے پیسے کوڑے بچا کر لاہور بھاگ گئے۔ میں نے اللہ سے پناہ مانگی محکمہ مال پر، دوسروں کی پیٹھ پر ٹیکس کے نوٹوں کے پلندے اور روپیوں کے کیسے لادتے

kitaabiyat.blogspot.com

لادتے اپنے اوپر کتابیں لادرہے ہیں۔'' (ص:۲۵۴)

منشی فیض اللہ کے حوالے سے فرحت بخش جملے دیکھئے:

''سات روپیہ ماہوار سے شروع کر کے بیالیس روپیہ ماہوار پر ریٹائر ہو گئے اور اکیس روپیہ ماہوار پنشن پا گئے جو منشی جی نے پورے پچیس سال وصول کی۔ بعد ملک الموت نے ان کے پنجہ سے محکمہ تعلیم کی گردن چھڑائی ورنہ جس طرح وہ عارف پور نوادہ کے مدرسہ کو چمٹ گئے تھے اس سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ محکمہ پر ناخن گاڑے ہوئے تھے۔'' (ص:۱۷۳)

ابوالفضل صدیقی نے جابجا اپنے عہد کی تصویر کشی کی ہے اور مسخ ہوتی قدروں پر گہرے کرب کا اظہار کیا ہے:

''اس دور غیبت میں جب کہ انبیائے کرام اور اولیائے محترم بھی یاروں کی زبان کی زد سے محفوظ نہیں، مولانا ہم عصر اور بعد والوں میں استثنیات میں سے ہیں۔'' (ص:۳۲)

''عہد ساز لوگ'' میں بعض ضمنی کرداروں کے اذکار مِنی یا مختصر قامت کے خاکوں کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ جمیل جالبی، ضیاء جالندھری اور عندلیب شادانی کی بیگمات کے تذکرے الگ روپ دینے کا تقاضا کرتے ہیں۔ شمیم احمد کا قصہ جمیل جالبی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بعض مواقع پر تو دونوں شخصیات کا موازنہ ہے۔ یہ کردار بھی مِنی خاکے کی صورت میں سامنے آیا ہے جو الگ حیثیت کا طلبگار ہے۔ بعض ضمنی کردار منفی نوعیت کے ہیں لیکن فاضل شخصیت نگار نے نام دینے سے گریز کیا ہے شاید خوفِ فسادِ خلق پیشِ نظر ہو یا پردہ داری مقصود ہو۔

ابوالفضل صدیقی کو طول بیانی کا ہڑکا کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ وہ مختصر سی بات، خیال، نظریئے یا واقعے کو وضاحتوں، تبصروں اور تمہیدوں سے دراز کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا بے لگام قلم اصلی راہ کو چھوڑ کر من مانے راستے پر دوڑنے لگتا ہے اسی باعث وہ ہر ہر موڑ پر بھٹکتے اور منزل سے دور ہوتے نظر آتے ہیں۔ اگر غیر ضروری مواد خارج کر دیا جاتا تو کتاب ایک تہائی رہ جاتی لیکن خاکے اپنی صحیح شکل صورت میں برآمد ہوتے اور نمایاں مقام پاتے۔

زیرِ نظر ''خاکہ نگار'' کے ہاں طویل جملہ معترضہ ہی نہیں طویل جملے بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔ ایک جملہ دیکھئے:

''اس کام میں بھی علمی و ادبی معیار سے زیادہ ذہانت و فطانت کا دخل ہوا کرتا جو اُن کے یہاں محفل میں بیٹھ کر بات کرنے سے لے کر علمی و ادبی محفلوں یا بڑے مغنیوں، موسیقاروں اور فنکاروں، شاعروں، ادیبوں کے تعزیتی جلسوں وغیرہ جیسے اجتماع میں نمایاں اور محفل پر چھا جانے والے استادانہ انداز میں جھلکتی تھی۔'' (ص:۸۹)

ابوالفضل بہت سے مواقع پر کھل کر بات کرنے کی بجائے زبان و بیان کے داؤ پیچ کا سہارا لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو سیدھی سادھی بات کو لفظوں کے پیچ و خم میں اتنا الجھا دیتے ہیں کہ یہ مرصع اور علامتی سی تحریر قاری کے لیے نشانِ استفہام بن جاتی ہے۔ اس کا اندازہ ص ۲۰۸ اور ۲۰۹ پر ''نیا دور'' سے متعلق امور سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک نمونہ ضیاء جالندھری کے شخصیت نامے میں صفحہ ۳۰۷۔۳۰۶ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ نامانوس علامتیت اور ابلاغ سے عاری استعاراتی زبان قاری کی وسعتِ مطالعہ، لیاقت اور ہوش مندی کا امتحان لیتی ہے۔

ابوالفضل کے شخصیت ناموں کا ایک بڑا عیب اپنی ذات کی نمائش ہے۔ کوئی شخصیہ ایسا نہیں جس میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھانکنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ بعض اوقات یہ تاک جھانک اتنی بڑھ جاتی ہے کہ خاکہ نگار ممدوح سے زیادہ عیاں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کے حوالے سے اتنا مواد فراہم کیا ہے کہ تجزیہ کرنے کے بعد ان کا اپنا ضخیم خاکہ تیار ہو سکتا ہے۔

ابوالفضل انگریزی الفاظ بے تکلف اور بے محابا استعمال کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس عمل سے پاک ہو۔ بے شمار الفاظ ایسے ہیں جن کے اردو الفاظ زیادہ مؤثر ہوتے۔ اگر وہ چاہتے تو اردو میں بہتر متبادل لا سکتے تھے کیونکہ وہ لفظ گر ہیں اور لفظوں کا گہرا

kitaabiyat.blogspot.com

شعور رکھتے ہیں۔ ان کی اس ''بے ساختگی'' نے ان کی تحریر کو گھن لگایا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں تعقید لفظی، تنافر اور اسقام کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں:

''ایسے موقع پر میں نے مجوز مجسٹریٹوں اور ایماندار ججوں کو بلیک میل کر جاتے پایا ہے۔'' (ص:۶۲)

''ان کے اکثر جاننے والوں کو ان کے پاکستان پہنچنے کے بعد علم ہوا اور خیال ہے کہ ان کے ادبی و صحافتی میدان کی ساکھ نے اس کو آڑ بنا کر ان کے قدر شناسوں کو ان کو روزگار فراہم کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔'' (ص:۹۰)

ابوالفضل صدیقی کے شخصیوں میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ خیالات، نظریات اور واقعات کی تکرار اتنی کثرت سے ہے کہ قاری کی بھنویں سکڑنے لگتی ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بات پہلے بھی کہی گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ''عہد ساز لوگ'' کی ترتیب کے وقت مسودے پر نظر ثانی نہیں کی گئی ورنہ یہ عیب بار بار سامنے نہ آتا۔ ابوالفضل کے خاکے کو بے کیف بنانے میں اس خامی کا بڑا حصہ ہے۔

خاکہ نگار کو زیر نظر شخصیت کے محاسن و معائب بیان کرتے ہوئے ذاتی رائے اور تبصرے سے کلی طور پر گریز کرنا چاہیے جبکہ ابوالفضل صدیقی کے ہاں اس کا خاص اہتمام ہے۔ وہ تبصرے کے بغیر بات کو آگے نہیں بڑھاتے۔ ان کا تبصرہ چند لفظی بھی ہوتا ہے اور طویل بھی۔ اس رویئے سے ان کے خاکے کی ساکھ متاثر ہوئی ہے۔

اس ساری بحث کو چند سطروں میں یوں سمیٹا جائے گا کہ اگر ابوالفضل صدیقی ابلاغی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے سادہ و عام فہم انداز میں بات کرتے۔ موضوع سے بھٹک کر خیالات کے ہجوم میں کھونے اور طول کلام کی بجائے اختصار و جامعیت اور کفایت لفظی کو شعار بناتے۔ خودنمائی سے گریز کرتے اور صرف ممدوح پر توجہ مرکوز رکھتے تو ان کا خاکہ توانا ہو سکتا تھا۔

❁❁❁❁

عطاء الحق قاسمی

اردو میں قلمی خاکہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ پرانی نہیں۔ اس صنفِ ادب نے ابتدائی دور میں ہی اپنی اہمیت و افادیت کو منوالیا اور بہت سے خاکہ نگار جنم دے کر باثروت صنفِ ادب شمار ہونے لگی۔ اس کا دائرہ بڑے شہروں سے بڑھ کر مضافات تک پھیل گیا ہے جہاں نئے نئے اور اچھے خاکہ نگار جنم لے رہے ہیں اور ان کی تخلیقات اس صنف کے خزانے کو بھر رہی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی مزاح نگار، سفرنامہ نگار اور کالم نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے شخصی مضامین کا مجموعہ ''مزید گنجے فرشتے'' جولائی ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ ''عرضِ مصنف'' میں انہوں نے اپنے ان مضامین کو خاکے قرار دیا ہے۔ قاسمی صاحب سکہ بند ادیب ہیں۔ ان کی تخلیق پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے خاکے کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کی رائے جان لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

''خاکہ پنسل سکیچ کی طرح محض ٹیڑھی بینکی لکیروں کا مجموعہ اور اندر سے کھوکھلا نہیں ہوتا بلکہ اس میں مشاہدے کے حقیقی گوشے شگفتہ اسلوب میں پیش کیے جاتے ہیں اور کردار کا بامعنی اور مثبت تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمدردی، مردم شناسی، واقعہ فہمی اور نفسیاتی آگہی اچھے خاکہ نگار کے بنیادی اوصاف ہوتے ہیں ..... خاکے کا مقصد شخصیت کی متوازن عکاسی، تہذیبی حقائق کا انکشاف اور شخصی تاثر کی فنکارانہ پیش کش ہے۔'' (اردو ادب کی تاریخ ___ ص:۶۲۰)

kitaabiyat.blogspot.com

عطاء الحق قاسمی کے شخصی مضامین کی نمایاں خوبی شگفتگی ہے جو قاری کے چہرے پر تبسم کی کرنیں بکھیرتی ہے۔ وہ یونس بٹ کی طرح شخصیت کو کارٹون کے روپ میں پیش کر کے ہنسنے کا سامان فراہم نہیں کرتے بلکہ شخصیت کے ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے لفظی، واقعاتی اور مزاح کے دوسرے حربوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ مزاح کے ساتھ ساتھ متانت کا دامن بھی تھامے رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں سنجیدہ قومی معاملات پر دانشورانہ فکر کا چمکارا بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ سوئے ظن کی بجائے حسنِ ظن پر ایمان رکھتے ہیں۔ بعض اوقات خامی کی عمدہ توجیہہ کر کے زہر کو تریاق میں بدل دیتے ہیں۔ حفیظ جالندھری اور احمد ندیم قاسمی کے خاکوں میں عطاء الحق قاسمی کی یہ خوبی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے خاکوں میں ایک اور بات دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہ اپنے ممدوح کا ذکر کرتے کرتے ضمنی طور پر کسی اور کا واقعہ سنا کر اپنے مؤقف کو واقعاتی استدلال سے مضبوط بنا کر شخصیت کے قد کاٹھ میں اضافہ کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کے خاکوں میں بعض ادب پاروں کی مہک قاری کے قلب و جاں کو معطر کرتی ہے۔ ان کے ان جملوں سے علی احمد رفعت مرحوم کے شہرۂ آفاق شعر کی خوشبو آتی ہے۔

''یہ محبت خاصی گنجلک اور پیچیدہ چیز ہے۔ کبھی تو سمٹ کر ایک نقطے پر مرتکز ہو جاتی ہے اور کبھی پھیل کر کائنات کی وسعتوں پر حاوی ہوتی دکھائی دیتی ہے۔'' (ص:۲۷)

اب علی احمد رفعت کا شعر دیکھیے:

داستانِ حسن جب پھیلی تو لامحدود تھی
اور جب سمٹی تو تیرا نام بن کے رہ گئی

اسی طرح عطاء جب وقار انبالوی کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ

''یہ بزرگ اس وقت آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اسے غور

سے دیکھ لیں کہ کل اپنے بچوں کو فخر سے بتا سکیں کہ ہم نے بابا وقار انبالوی کو دیکھا تھا۔''

یہ سطور پڑھ کر بے اختیار علامہ اقبال یاد آ جاتے ہیں جنھوں نے یہی جملے مولانا قادر گرامی کے بارے میں ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے جس کی تفصیل مولانا عبدالمجید سالک کی تصنیف ''یارانِ کہن'' میں مولانا گرامی کے خاکے میں ملتی ہے۔ اسی طرح قاری جب قاسمی کے ان جملوں تک پہنچتا ہے تو ڈاکٹر عبادت بریلوی یاد آ جاتے ہیں:

''میں نے طفیل صاحب سے کہا کہ انہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ان کے پاس لاٹھیاں اور پستول ہیں تو آپ بھی اپنے کچھ آدمیوں کو ان کے مقابلے کے لیے تیار کریں یعنی نقوش کے کسی بھی خاص نمبر کی ایک ایک کاپی انہیں تھما دیں تاکہ کسی اچانک حملہ کا منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔'' (ص:۸۱)

اسی قسم کا مشورہ دلی عربک کالج کے ایک سادہ لوح پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد فارق نے ڈاکٹر عبادت بریلوی اور دیگر رفقاء کو تقسیم کے وقت ہندوؤں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے دیا تھا:

''صاحب، آپ بالکل پروا نہ کیجئے۔ آپ کے پاس ہتھیار تو ہیں نہیں۔ اگر حملہ ہو تو اپنی موٹی موٹی کتابوں سے ہندوؤں کو ماریں۔ آخر ان کتابوں کا یہ بھی تو مصرف ہونا چاہیے۔''

(یادِ عبد رفتہ — ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص:۲۰۹)

عطاء الحق قاسمی اپنے خاکوں میں دو شخصیات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور امجد اسلام امجد۔ دونوں کا کہیں نہ کہیں ذکر آ جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے ادب و احترام کا جذبہ کارفرما ہے جبکہ امجد اسلام امجد سے دوستی اور برابری کا تعلق ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ دونوں شخصیات عطاء کے ذہن پر چھائی ہوئی ہیں جو کسی نہ کسی صورت

kitaabiyat.blogspot.com

آ موجود ہوتی ہیں۔ امجد کا حوالہ تو حیلے بہانوں سے آتا ہے۔ ایسا ہونا فطری امر ہے کیونکہ انسان جس سے متاثر ہوتا ہے اس کا حوالہ بار بار آتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی زبان و بیان کے حوالے سے خاصے غیر محتاط واقع ہوئے ہیں۔ پنجابی الفاظ، محاورات اور روزمروں کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔ مثلاً: ص۱۹۲ پر ''چھلیڈے'' کی جگہ ''چھلاوہ'' استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ''لاڈیاں شروع کردیں'' کی جگہ اردو روزمرہ ''لاڈ شروع کردیئے'' لکھا جانا چاہیے۔ اسی طرح یہ جملہ دیکھیے: ''اس کے ہاتھوں میں چھیک ہے۔'' (ص:۲۰۸) اس کی بجائے یہ درست جملہ لکھا جاسکتا تھا کہ ''اس کے ہاتھوں میں چھید ہیں۔'' ہوسکتا ہے کہ لاہوری فضا میں مسلسل سانس لینے کے سبب انہیں پنجابی روزمرے فصیح معلوم ہوتے ہوں لیکن فی الحقیقت ان مقامات پر اردو الفاظ و محاورات ہی مناسب تھے۔ انہوں نے بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جن سے صرف پنجابی حضرات ہی واقف ہیں۔ دوسرے صوبوں اور زبانوں کے لیے نامانوس الفاظ ہیں۔ مثلاً ''نوندریں مارنا' پنجابی سے ناواقف شخص کے لیے قطعی اجنبی محاورہ ہے۔ پنجابی الفاظ و محاورات کی ناگوار حد تک دانستہ آمیزش نے عطاء الحق قاسمی کی تحریر کے حسن کو گہنایا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں زبان و بیان کی اغلاط کی بھی بھرمار ہے۔

''ابوظہبی میں مقیم پاکستانی شاعر شیخ پر فقرے مار مار کر اسے ادھ موا کردیا۔''

اردو محاورہ فقرے چست کرنا ہے فقرے مارنا نہیں۔ اسی طرح ایک مقام پر سرگودھا کو سرگودھے لکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ انشاء کے اصولوں کو روند کر جان بوجھ کر غلط الفاظ و محاورات کو رواج دینے کی کوشش کررہے ہیں۔ ورنہ عطاء الحق کے حوالے سے یہ بات تسلیم کرنا ممکن نہیں کہ وہ زبان کے اصولوں سے ناواقف ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کے بیشتر خاکے کالم نویسی کا اسلوب رکھتے ہیں۔ جبکہ خاکہ نگاری کا اپنا اندازِ بیاں ہوتا ہے۔ اگر عطاء الحق قاسمی کے ذہن میں یہ بات ہوتی کہ وہ خاکہ لکھ رہے

ہیں تو ان کا اسلوب اس خامی سے پاک ہوتا۔

عطاء الحق قاسمی چونکہ قوم کا درد دل میں رکھتے ہیں اس لیے جہاں انہیں موقع ملتا ہے مبلغانہ فریضہ انجام دینے لگتے ہیں۔ ان کے بہت سے شخصی مضامین میں یہ بات ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے جو اگرچہ خاکے کی روایت کے برعکس ہے لیکن عطاء ملّی احساس کو فن کی بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار نہیں۔

''مزید گنجے فرشتے'' کے مطالعے کے دوران کئی مقام ایسے آتے ہیں جہاں واقعات اور خیالات کی تکرار ہے جو قاری کے ذہن پر خوشگوار اثر نہیں چھوڑتی۔ اگر کتاب کی ترتیب کے دوران نظر ثانی کی جاتی تو یقیناً تراش خراش کے بعد یہ خامی دور ہو جاتی۔

عطاء الحق قاسمی کے خاکوں میں اچھی تشبیہات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شخصیت کے نکھار کا سبب بننے والی ایک تشبیہ دیکھیے:

''انجم صاحب ہر وقت مترنم لہجے میں ہولے ہولے کھانستے رہتے ہیں۔ جب وہ کھانس رہے ہوں تو ایسے لگتا ہے کہ ایک ''ردھم'' کے ساتھ چاندی کے ورق کوٹے جارہے ہیں۔'' (ص:۷۵)

عامیانہ اور سطحی انداز کی تشبیہات بھی عطاء کی خاکہ نگاری کا جزو ہیں۔ اے جی جوش کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''ان کے شعروں میں شاعر کسی بھونڈ عاشق کی طرح لسوڑے کے روپ میں نظر نہیں آتا بلکہ وہ محبوب کو بالکل اسی طرح 'لائٹ' لے رہا ہے جس طرح محبوب نے اس کو 'لائٹ' لیا ہے۔'' (ص:۱۶۷)

عطاء الحق کے شخصی مضامین کی تمہید بیشتر اوقات غیر ضروری طویل اور غیر متعلق ہوتی ہے۔ ایک بات سے دوسری بات کی طرف جاتے جاتے موضوع ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد پھر سرا پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پورے مضمون میں اِدھر اُدھر کی باتیں

kitaabiyat.blogspot.com

زیادہ ہوتی ہیں۔ ممدوح سے متعلق مواد کم ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کالم میں تو چل جاتا ہے لیکن خاکے میں عیب تصور کیا جاتا ہے۔ عطاء کے ہر ''خاکے'' کا ایک چوتھائی حصہ یہاں وہاں کی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے، ایک چوتھائی میں وہ خود جلوہ گر ہوتے ہیں بقیہ نصف اور بعض اوقات اس سے بھی کم بے چارے ممدوح کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ اس میں بھی شخصیت سے زیادہ فن پر اظہار خیال ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ فن کی روشنی میں شخصیت کو دیکھتے ہیں جبکہ خاکہ شخصیت کے ظاہری و باطنی خدوخال سے ہی تشکیل پاتا ہے۔

خاکہ لکھنے کے دوران اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ممدوح کی شخصیت ہی سامنے آئے۔ اس کے پردے میں خاکہ نگار خود ظاہر نہ ہو۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہے۔ عطاء الحق پردہ چیر کر سامنے آتے ہیں۔ شاید ہی کوئی خاکہ ایسا ہو جس میں ان کا اپنا ذکر خیر نہ ہو۔ ہر جگہ ''میں'' آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ انعام الحق جاوید کے خاکے کی ابتدائی سطور میں ہی اپنی ذات پر آ جاتے ہیں:

> ''دراصل میں ایک شدید جذباتی شخص ہوں۔ میں محبت کرتا ہوں یا نفرت۔ چنانچہ مجھ سے دوستوں کا قصیدہ لکھنے کی اہلیت ہے یا دشمنوں کی ہجو کہہ سکتا ہوں تاہم کسی بے وفا دوست کی ہجو سے حتی المقدور گریز کرتا ہوں کیونکہ کسی دوست کی گھٹیا حرکت کو لوگوں کے سامنے لاتے ہوئے اس دوست سے زیادہ مجھے اپنی سبکی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ محاذ آرائی کی بجائے میں اس دوست سے آہستہ آہستہ دور چلا جاتا ہوں۔ دوست میرا پرابلم ہیں۔ مجھے ان کے لیے بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا تو مجھے اس میں سراسر منافع ہی نظر آتا ہے۔'' (ص:۱۴۱)

سراج منیر کے ''خاکے'' کی ابتدائی سطور میں بھی اپنے حوالے سے نوائے وقت کے ادبی ایڈیشن میں جدت پیدا کرنے کی تفصیلات بتانی شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا ایک دو مضامین تک بس نہیں بلکہ تقریباً ہر مضمون میں اس نوع کی باتیں ملیں گی۔ اگر تمام ''خاکوں'' میں سے ان باتوں کو چن کر یکجا کر دیا جائے تو ''عطاء کی کہانی عطاء کی زبانی'' کے عنوان سے خاصا طویل مضمون مرتب ہو سکتا ہے۔

عطاء کے بہت سے ''خاکے'' ایسے ہیں جن میں ممدوح سے ہٹ کر ضمنی شخصیات کی غیر ضروری حد تک تحسین کی گئی ہے۔ ایسی صورت میں ان پر خوشامد کا الزام عاید ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ وقار انبالوی کے مضمون میں مجید نظامی کی توصیف پر اسی قسم کا گمان ہوتا ہے۔ سلیم اختر کے خاکے میں ڈاکٹر طاہر تونسوی Obliged کیے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح شوکت علی شاہ کے مضمون میں بھی یہی تاثر ابھرتا ہے۔

''مزید گنجے فرشتے'' میں احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے دو خاکے شامل ہیں جنہیں یکجا کر دیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ دوسرا حصہ پہلے کی نسبت زیادہ خوبصورت ہے۔ اس میں احمد ندیم قاسمی کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ وہ بھی خوبیاں محسوس ہوتی ہیں۔ ایسی سطور حسن ظن کا عمدہ نمونہ ہیں۔ مزاح کی لہریں اس کے حسن میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔ عطاء الحق کو چونکہ احمد ندیم قاسمی صاحب سے قرب حاصل ہے اس لیے وہ ان کا عمدہ خاکہ لکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔

حفیظ تائب کا پہلا خاکہ بہت اچھا ہے جبکہ دوسرے کو فنی لحاظ سے کسی طور خاکہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسے مضمون کے زمرے میں لایا جائے گا۔

پریشان خٹک کا خاکہ مکمل، بھرپور اور عمدہ ہے جبکہ دلدار پرویز بھٹی کا خاکہ بھی توجہ سے لکھا گیا ہے۔ لہٰذا اسے بھی عطاء کے اچھے خاکوں میں شمار کیا جائے گا۔

خالد احمد کا خاکہ جدت کا نمونہ ہے تاہم اس انداز میں اور بھی خاکہ نگاروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ نذیر ناجی اور اشفاق نقوی کے خاکے اوسط درجے کے ہیں جبکہ ضیاء الحق قاسمی کا خاکہ بھی کافی بھلا ہے۔ اے جی جوش، ناصر زیدی اور مختار حسین ترابی سے متعلق لکھی گئی تحریروں کو بھی خاکے قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں عطاء نے اپنی روایت کو نبھاتے ہوئے

kitaabiyat.blogspot.com

ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا ہے۔

شفیق الرحمٰن کی شخصیت کے صرف دو تین پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مضمون میں تاثرات زیادہ ہیں۔ شخصیت سے متعلق معلومات کم ہیں۔ آخری پیراگراف میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

احسان دانش کی شخصیت کا احاطہ کرنے کی بجائے ایک آدھ پہلو واضح کیا گیا ہے۔ قتیل شفائی کا بھی تقریباتی مضمون ہے جس میں خاکے کا Touch ضرور ہے۔ لیکن مکمل خاکہ ہرگز نہیں ہے۔ آغا نثار کی ذات پر بہت کم اظہار کے سبب ادھورا خاکہ ہے۔ جبکہ شبنم شکیل کے باب میں ان کے فن پر خاصا کچھ کہا گیا ہے۔ اس مضمون میں شبنم کی شخصیت کے پرت پوری طرح نہیں کھلتے۔ افتخار عارف کا اچھا خاصا خاکہ لکھا جا رہا تھا لیکن رخِ فن کی طرف مڑ گیا اور خاکے کا ستیاناس ہو گیا۔ اس میں کالم کا اسلوب جھلکتا ہے۔ اسی طرح مولانا مودودیؒ کا خاکہ بھی کالم نما ہے اس میں مولانا کی شخصیت کے خدوخال ہلکے ہلکے ابھرے ہیں، بھرپور تصویر سامنے نہیں آئی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ عجلت میں لکھا گیا ہے۔ انجم رومانی کے خاکے کو اچھا قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہ بھی اور بہت سوں کی طرح تقریب کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس لیے اس میں تقریباتی اسلوب جھلکتا ہے۔ ضمیر جعفری کی صرف شگفتہ طبعی کو بیان کیا گیا ہے۔ باقی اوصاف فاضل خاکہ نگار کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں یا پھر فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لیے یہ بھی مضمون ہی شمار ہوگا۔ سراج منیر سے متعلق لکھی گئی تحریر میں بھی بہت زیادہ تشنگی ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مضمون کالم کے لیے لکھا گیا ہے۔ چونکہ کالم میں جگہ کم ہوتی ہے اس لیے اس میں ادھورے پن کی خامی در آئی ہے۔ شوکت علی شاہ کی شخصیت کے بجائے فن پر زیادہ اظہار خیال ہے۔ یہ تاثراتی مضمون ہے خاکے کے لوازم کو پورا نہیں کرتا۔ اسی طرح سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مسرت لغاری کے مضامین خاکے کے فنی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ نیئر آپا کا مضمون بھی کالم کا تاثر چھوڑتا ہے۔

''اباجی'' کے متعلق گمان تھا کہ یہ بھی ''ماں جی'' کی طرح شاہکار ہوگا۔ لیکن یہ خیال

خام ثابت ہوا۔ ایسا مضمون کوئی بھی واقف قلمکار لکھ سکتا تھا۔ عطاء اگر ڈوب کر لکھتے تو یقیناً اچھا خاکہ ثابت ہوتا۔ چونکہ اس مقام پر توقع زیادہ تھی اس لیے مایوسی بھی زیادہ ہوئی ہے۔

محمد طفیل کے ''خاکے'' میں ان کی ذات کے حوالے سے معمولی سی آگہی ہوتی ہے جس کے سبب یہ مضمون بھرپور خاکے کا درجہ پانے سے محروم رہ گیا۔

مجید نظامی کا مضمون نامکمل ہونے کے سبب کتاب میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ اگرچہ آخری پیراگراف میں وضاحت ہے جو کافی نہیں۔ عطاء کے اس مجموعے میں میکسم اور کچھ دوسرے بھرتی کے مضامین ہیں جن سے مجموعے کا معیار متاثر ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ناشر نے کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے مضامین جمع کر لیے۔ خاکوں کے مجموعے کے لیے کڑا معیار برتا جاتا تو فنی لحاظ سے ایسی پسماندگی ہرگز نہ ہوتی۔

عطاء الحق قاسمی کے خاکے پڑھ کر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انہوں نے خاکے محنت سے نہیں لکھے بلکہ رواروی میں لکھے ہیں۔ کاش وہ لکھتے ہوئے خاکے کے لوازم کا خیال رکھتے۔ صرف کالم ہی سر پر سوار نہ ہوتا۔ انہوں نے جو تقریباتی خاکے لکھے ہیں وہ بھی سر سے بوجھ اتارنے کے مترادف ہیں بلکہ بعض تو ایسے پھسپھسے ہیں کہ تقریبات کے لیے بھی نہیں لکھے جاتے۔ ''مزید گنجے فرشتے'' پڑھ کر یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ انہوں نے شاید ہی کسی خاکے کا حق ادا کیا ہے یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بیشتر مضامین میں خاکے کا ذائقہ تو ہے لیکن انہیں مکمل خاکے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عطاء کی عدم توجہی نے ایک بڑے قلمکار کی تخلیقات کو نمایاں صف میں لانے سے محروم کر دیا ہے۔

kitaabiyat.blogspot.com

یونس جاوید

یونس جاوید افسانے اور ڈرامے کا ایک معتبر نام ہے جنہوں نے شخصیت نگاری کے کنویں میں ڈول ڈال کر علم و ادب کی بارہ شخصیات کے احوال کو تشنہ اذہان کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے یہ کام کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں کیا۔ بقول ان کے اپنے کسی ضرورت یا باہر سے فرمائش کے تحت ہو گیا اس کے علاوہ ان کا اظہار بھی راستہ چاہتا تھا جس نے موقع غنیمت جان کر بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان کے شخصی مضامین کا مجموعہ ''ایک چہرہ یہ بھی ہے'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آیا جسے انہوں نے خاکوں سے تعبیر کیا ہے۔ آیئے! ان تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہ خاکہ نگاری کے فن پر کس حد تک پوری اترتی ہیں۔

پہلی تحریر ''تاج صاحب — سید صاحب'' ہے جس کے پہلے آٹھ صفحات میں امتیاز علی تاج کے ماتحتوں سے حسن سلوک اور تاریخِ ڈرامہ کی تدوین میں غیر معمولی انہماک کا تفصیلی ذکر ہے لیکن شخصیت کے دوسرے زاویئے پیش نہیں کیے گئے۔ تاج کے محاسن ادھورے ہیں جبکہ معائب تو ہیں ہی نہیں۔ تھوڑی سی محنت کرنے سے خوبصورت خاکہ تشکیل پا سکتا تھا۔ تاہم ان صفحات کی اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی سبب صرف ان صفحات کو 'خاکہ نما' قرار دینے کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے لیکن اس کے بعد کے ۲۴ صفحات میں تو غضب ہی ہو گیا۔ ''بعد مرنے کے کہانی میری'' کے ذیلی عنوان کے تحت امتیاز علی تاج کے قتل سے متعلق خبروں اور اداریوں کو جمع کر دیا گیا جن کی خاکے میں قطعی گنجائش نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ ''اجتماعی'' مضمون قرار پاتا ہے۔ معلوم نہیں، یونس جاوید جیسے ہوشمند ادیب نے یہ سب کچھ کیوں کیا جبکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی یہ کاوش خاکے کو بری طرح مجروح کرنے کے مترادف ہے۔

''دوسرا دن'' پروفیسر حمید احمد خاں کے حوالے سے تاثراتی مضمون ہے جو وفات کے دو روز بعد حلقہ ارباب ذوق کے تعزیتی اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا۔ جسے یقیناً ایک ہی نشست میں تحریر کیا گیا۔ عرق ریزی نہ ہونے کے سبب یہ چاشنی کی صفت سے محروم ہے۔ حمید احمد خاں کی ذات کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالنے کی گنجائش باقی تھی اس لیے یہ اپنی کشش کھو بیٹھا ہے۔ لیکن اس کے سادہ و رواں اسلوب سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی۔

''جوگی'' احمد بشیر کا تخلیقی انداز میں لکھا گیا بھرپور اور پُر اثر خاکہ ہے لیکن غیر ضروری مواد نے اسے گہنایا ہے۔ یونس جاوید نے احمد بشیر کے خاکوں کا مجموعہ ترتیب دیا تھا جس کی دو صفحات پر مشتمل داستان غیر ضروری ہے اسی طرح یوسف کامران پر وقف ڈیڑھ صفحہ بھی اضافی ہے۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ تھا کہ خاکہ نگار کا قلم صرف ممدوح کی شخصیت تک محدود رہتا اور اس کی ذات کو کھنگالتا رہتا۔

سلیم شاہد پر لکھا گیا ''ونجارا'' غالباً سب سے عمدہ خاکہ ہے اس میں شخصیت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس خاکے میں یونس جاوید کا فن نکھر کر ہمارے سامنے آیا ہے۔

''فلیش بیک'' سے نذیر ناجی کی ذہانت، دوست نوازی، غربت، لڑاکا طبیعت، مفاد پرستی اور شراب نوشی کا پتہ چلتا ہے۔ اس خاکے میں مثبت تاثر اجاگر کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن واقعات نے منفی پہلو کو زیادہ ابھارا۔ اس خاکے میں زاہد ڈار کے عشقوں کی داستان کا جملہ معترضہ غیر ضروری پیوند کاری کے مترادف ہے۔

''لاہور کا دروازہ'' تخلیقی انداز میں لکھا گیا خاکہ ہے جس میں یونس ادیب کی شخصیت کے خدوخال خاصی حد تک ابھرے ہیں اسے پڑھ کر قاری زیر نظر شخصیت میں موجود لیاقت اور اعلیٰ انسانی قدروں کا قائل ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں یونس ادیب کو ''کھلا دشمن'' کا لقب دیا گیا ہے۔ خاکے میں یونس ادیب کی محبتوں کا تو ذکر ہے لیکن عداوتیں نظر انداز کر دی گئیں جو یونس ادیب کو کھلا دشمن ثابت کرتیں۔ اس خاکے میں بھی غیر متعلق مواد خاصی حد تک موجود ہے جو خاکہ نگار کے والد کی دکان، قلم اور ساغر صدیقی کے حوالے سے ہے۔ اس کے

kitaabiyat.blogspot.com

علاوہ اورینٹل کالج میں ادبی محفل کی تمہید بھی غیر ضروری ہے۔

''کن ٹٹا'' میں عطاء الحق قاسمی کی ذات کے دائرے سے نکل کر ان کے فن اور کالموں کو طویل خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ فاضل خاکہ نگار نے جملہ معترضہ کی اپنی روایت کو یہاں بھی نبھایا ہے جو رفیق غزنوی سے متعلق ہے۔ اگر تمام غیر ضروری مواد نکال دیا جائے تو یہ مضمون مناسب خاکے کا روپ اختیار کر سکتا ہے۔

''اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو'' دلدار پرویز بھٹی سے متعلق تحریر ہے جس میں دلدار سے سرِراہ ملاقات کا احوال اور اس کے جنازے کی روداد ہے۔ یہ مضمون دلدار کی شخصیت کے ظاہری و باطنی خدوخال پر اچھی طرح روشنی ڈالنے سے قاصر ہے۔ اس تاثراتی مضمون کو 'خاکے کی جانب بڑھتا ہوا قدم' قرار دیا جا سکتا ہے۔

''خوشبو اور دھواں'' میں کمال احمد رضوی کی شخصیت کے دو تین پہلوؤں پر تخلیقی اسلوب میں روشنی ڈال گئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمال احمد رضوی اعلیٰ ظرف، زندہ دل اور گپ ہانکنے کے اوصاف کے مالک ہیں۔ اس تحریر میں کمال کے فن پر بھی اظہار خیال ہے جس کی خاکے میں گنجائش نہیں اس کے علاوہ پی ٹی وی ایوارڈ کے حوالے سے غیر ضروری باتیں شامل ہیں۔ یونس جاوید نے کمال کو بہت قریب سے نہیں دیکھا اور ملاقاتیں بھی کم ہیں جس کے سبب وہ کمال احمد رضوی کا کامیاب خاکہ نہیں لکھ پائے۔

''بلا عنوان'' اے جی جوش سے متعلق شگفتہ تحریر ہے جس کی خوبصورتی سے انکار نہیں لیکن یہ انداز بیان خاکے کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ شخصیت کے حوالے سے جا بجا یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا واقعی یہ درست ہے؟ کیا یہ زیب داستان کے لیے تو نہیں؟ یونس جاوید کی اس تحریر کو طنز و مزاح میں تو جگہ دی جا سکتی ہے لیکن غیر سنجیدگی کے باعث شخصی خاکہ کی حدود سے دور ہی رہتی ہے۔

''مونا سکھ'' کنول فیروز سے متعلق اچھا خاکہ ہے۔ ''حواشی'' میں دوسروں کے عشقوں کو پروان چڑھانے اور شادی میں مدد دینے کے واقعات کو کفایت لفظی کے ساتھ عمدگی سے بیان کیا جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔ ''حواشی'' کی موجودہ صورت خاکے کو گہنا رہی ہے۔

یونس جاوید کو اپنی ماں سے جتنا لگاؤ تھا اس کا تقاضا تھا کہ کوئی معرکتہ الآراء خاکہ سامنے آتا۔ لیکن وہ ''چراغ آخر شب'' میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ یہ مضمون ماں اور بیٹے کے حوالے سے واجبی سی تحریر ہے جس میں غیر ضروری مواد کی بھرمار ہے۔ والد کے کاروبار، جذبہ جہاد اور دیگر اذکار سے بہتر تھا کہ ان کا الگ خاکہ لکھ دیا جاتا۔

یونس جاوید انسانی نفسیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں ان کے شخصی مضامین میں انسانی رویوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ عبارت نوجوانوں کی عمومی نفسیاتی کیفیت کی غماز ہے۔

> ''کنول نے نہ ہی کبھی غزل سنائی اور نہ ہی خود ساختہ محبت کی کہانی، جو ہم میں سے اکثر کا معمول تھا۔ خواہشوں کو کہانی کا روپ دے دے کر رومانٹک کتھائیں بُنی جاتیں اور دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی کہ فلاں تو مجھ پر مرمٹ ہی گئی ہے۔'' (ص:۱۵۳)

یونس جاوید کی تحریر میں حکمت و دانائی کے جملے جھروکوں سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ جن کی آب و تاب قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ ان کی حکمت، بصیرت اور فلسفیانہ سوچ کا ماخذ و منبع 'بچہ' ہے جو مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں ابھرتا ہے۔ کبھی وہ اے جی جوش کے اندر چھپے بیٹھے بچے کو تلاشتے ہیں اور کبھی کنول فیروز کی بچوں سے محبت کے ذکر میں یہ نکتہ واضح کرتے ہیں۔

> ''بچوں کی عدالت میں آدمی کتنا بھی سچ بولے، بری نہیں ہو سکتا ان کی عدالت، ان کے قوانین، ان کی معصومیت، ان کی محبت، سب سے الگ ہے۔ اسے شعوری حدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔'' (ص:۵۵)

یونس جاوید کے ہاں زندگی سے قریب تر نادر و عمدہ تشبیہات بھی ملتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی تشبیہ میں گہرا طنز بھی جھلکتا ہے۔

kitaabiyat.blogspot.com

''اور جوش صاحب نے کار کو ایمبولینس ڈیکلیئر کر دیا جس
طرح حکومتیں کنالوں پر پھیلی ہوئی کوٹھیوں کو سب جیل ڈیکلیئر
کر دیا کرتی ہیں۔'' (ص:۱۴۱)

یونس جاوید کے ''خاکوں'' میں جملہ معترضہ کا بہت عمل دخل ہے جس نے خاصا خلل پیدا کیا ہے۔ ان کی کوئی بھی شخصی تحریر اس ''عنصر'' سے خالی نہیں۔ بعض اوقات اس کا پھیلاؤ صفحوں تک محیط ہوتا ہے۔ کچھ مضامین میں تو کئی کئی جملہ معترضہ ہیں۔ اگر ان اذکار کو الگ کر دیا جاتا تو خاکوں کی نک سک درست ہو جاتی۔ خاکے میں تمام تر توجہ شخصیت پر ہی مرکوز رہنی چاہیے اردگرد کی شخصیات اور ماحول میں بھٹک کر گم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ان کے بغیر زیر بحث شخصیت ادھوری محسوس ہو رہی ہو تو سرسری سے ذکر کے بعد آگے بڑھ جانا چاہیے۔ غیر ضروری اور غیر متعلق اذکار خاکے کو بھدا بنا دیتے ہیں۔

کچھ اہلِ قلم اردو میں پنجابی الفاظ و محاورات کی دانستہ آمیزش کر کے زبان کو نئی شکل دینا چاہتے ہیں۔ یونس جاوید کی نثر بھی انہی کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے کیونکہ ان کے شخصی مضامین میں غیر ضروری حد تک پنجابی الفاظ و روزمرے بکثرت نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

''اس نے قصائی کا انتظار کرنے کے بجائے ساری فیملی کو وختا
ڈال دیا۔'' (ص:۸۵)

''میرے کانے دیکھ کر وہ کھل کر ہنسا..... سول لائن کے تھانے
میں اتنی اونچی چانگر کبھی نہ سنی تھی۔'' (ص:۸۷)

''تاہم داخلہ ملتے ہی میں نے اپنے خواب کی تکمیل میں ٹوٹے
ٹوٹے جوڑ کر کئی دنوں کی محنت سے افسانہ لکھا تھا۔'' (ص:۱۱۱)

''یہ بوجھ ٹی ہاؤس کی میزوں پر تھرتھلیاں ڈالتا اور بٹتا رہتا
ہے۔'' (ص:۱۳۷)

''جوش ایسا بپا آدمی ہے کہ ..... ڈنر کرانے کے بعد گھر بھی
چھڈ کے آتا ہے۔'' (ص:۱۴۰)

''عطاء نے ایک مرتبہ پھر کاں کی طرح سیانا ہونے کا ثبوت دیا۔''

''جس نے مجھے کنول فیروز پوری کی صورت میں گفٹ کیا کہ
میرے گوڈوں گٹوں تک میں بیٹھ گیا۔''

''اب اس کے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ وہ ہر موسم میں اپنی
شاخیں چھانگتا رہے۔'' (ص:۱۱۸)

یونس جاوید اتنے غیر محتاط ہیں کہ ان کی نثر میں پنجابی کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ بھی بے دھڑک در آتے ہیں۔ کچھ انگریزی الفاظ تو درج بالا حوالوں میں بھی ملیں گے چند مزید پیشِ خدمت ہیں:

''میں نے انہیں اکیڈمی آف لیٹرز کی نیشنل کانفرنس میں چہکتے
اور 'اپوزٹ سیکس' کو مہکتے بھی دیکھا ہے۔'' (ص:۱۴۹)

''اس فیلڈ میں وہ اس وقت سے ہے.....'' (ص:۹۰)

''وہ ہر میدان میں اپنی کپیسٹی سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔'' (ص:۹۱)

یونس جاوید نے خاکہ نگاری میں چونکہ سنجیدگی اختیار نہیں کی اس لیے وہ اچھا خاکہ لکھنے میں ناکام رہے ہیں وہ خود لکھتے ہیں:

''جب میرا دل دوسروں کے بارے میں سچ بولنے کو دھڑکتا ہے تو
میں خاکہ لکھنے یعنی خاک اڑانے بیٹھ جاتا ہوں۔'' (ص:۱۳۶)

یعنی ان کے نزدیک خاک اڑانے سے ہی خاکہ ترتیب پاتا ہے۔ یونس جاوید اپنے منتشر مضامین کو یکجا کرتے ہوئے نظر ثانی کر لیتے اور خاکے کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے تو ان کا خاکہ کبھی بھی اتنی کسمپرسی کا شکار نہ ہوتا۔

❁❁❁❁

kitaabiyat.blogspot.com

محمود علی

خاکہ نگاری ایک فن ہے۔ بعض لوگ شعوری طور پر فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاکہ لکھتے ہیں جبکہ بعض، شخصیات کے حوالے سے بیتی یادوں کو صفحۂ قرطاس کی زینت بناتے ہیں۔ اس عمل سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں بھی اجاگر ہوتی ہیں۔ کل تک جو لوگ گمنامی کا شکار ہوتے ہیں اپنی تصنیفات سے ادب کے قارئین کے ذہنوں میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ ایسے ہی قلمکاروں میں ایک محمود علی بھی ہیں جو علمی و ادبی دنیا میں کوئی شناسا سا نام نہیں لیکن چہرہ شناسی کے حوالے سے لکھی گئی اپنی تصنیف ''شرفِ ملاقات'' کی بدولت ادبی حلقوں میں یقیناً معتبر حوالہ بنیں گے۔

محمود علی سعودی عرب میں ملازم رہے پھر پاکستان آ گئے۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۰ء تک لاہور کے امریکی قونصل خانے میں سیاسی امور کے ماہر و مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہیں چوٹی کے سیاستدانوں کو خاصا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں ۴۱ اہم دینی و سیاسی شخصیات سے ملاقاتوں کا احوال قلمبند کیا ہے۔

محمود علی کے خاکوں کا اہم وصف رواداری و غیر جانبداری ہے۔ کہیں بھی کسی طبقے سے نفرت و بیزاری کا جذبہ ابھرتا دکھائی نہیں دیتا۔ مولانا مودودی اور غلام احمد پرویز پر لکھے گئے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مختلف ادوار میں دونوں اصحاب کی فکر سے متاثر تھے۔ پرویزی افکار نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے لیکن جب ہم مولانا شاہ احمد نورانی، حافظ ریاض حسین، مولانا حامد میاں، مفتی محمد حسین نعیمی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا سراج احمد دین پوری، مولانا عبدالقادر آزاد، مولانا عبیداللہ انور جیسے مختلف الفکر علماء کے خاکے پڑھتے ہیں تو ہمیں محمود علی کے عقائد کا عکس کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ سب علماء اور ان کے عقائد کا احترام

کرتے ایسے نظر آتے ہیں کہ جیسے یہ انہی کے پیروکار ہوں۔ گویا انہوں نے مخصوص مذہبی نظریہ رکھنے کے باوجود عصبیت کو اپنی شخصیت کا جزو نہیں بنایا۔ غلام احمد پرویز کا یہ معتقد جب اپنے عقائد کے برعکس ایک محفلِ میلاد میں گیا تو اس کے جذبات یہ تھے:

> ''پیر صاحب کے گھر بیٹے کی ولادت اور اس پر آقائے نامدار ﷺ کے میلاد کی سعادت، دونوں خوشیاں ایسی تھیں کہ میں سر کے بل وہاں گیا اور تیسری مسرت میرے حصے میں تب آئی جب مولانا شاہ احمد نورانی کو اس بزم کا میر پایا۔ رات کے کھانے سے پہلے جب ذکر حبیب کبریا ﷺ کی خوشبو سے پیر صاحب کے دولت کدہ مہک اٹھا، مولانا کا قیام محفل کے ساتھ یا نبی سلام علیک — یا رسول سلام علیک، یا حبیب سلام علیک — صلوٰۃ اللہ علیک، عربی کے ایک خاص دھیمے ترنم سے پڑھنا اور ان سلاموں کے درمیان عربی زبان میں مدحتِ الامام الانبیا ﷺ کے بند بارگاہِ نبوت ﷺ میں پیش کرنا — کم از کم محفل کے اختتام تک ہم گناہگاروں کو فرشتوں کا ہم پلہ ضرور بنا گیا ہوگا۔'' (ص: ۴۹)

محمود علی کے بیشتر خاکوں میں ''جملہ معترضہ'' کا عمل دخل ہے۔ ان میں بہت سی دوسری شخصیات کے حوالے سے معلومات پڑھنے کو ملتی ہیں تاہم اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہیں کہیں اصل شخصیت دوسرے اصحاب کے ذکر کے پردے میں چھپ جاتی ہے لیکن بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ تحریر بے مزہ نہیں ہوتی۔ جیسے مولانا سراج احمد دین پوری کے خاکے میں مولانا عبداللہ درخواستی کی بے اعتنائی، مولانا محمد اجمل خاں اور مزدور لیڈر مرزا محمد ابراہیم کی امریکی سفارتکار سے ملاقات کے انکار کے واقعات۔ اسی طرح مخدوم زادہ حسن محمود کے خاکے میں سابق وفاقی وزیر عبدالوحید خاں کا تفصیلی تذکرہ۔

kitaabiyat.blogspot.com

خاکہ نگاری کے بعض ناقدین اس بات پر مُصر ہوتے ہیں کہ خاکے میں شخصیت کی خامیوں کا ذکر ضروری ہے تب ہی خاکہ مکمل ہے ورنہ نہیں کیونکہ انسان کی شخصیت کے دونوں ہی رخ ہیں لیکن میرا نکتہ نظر یہ ہے کہ اگر شخصیت کے خدوخال تیکھے اور دلکش ہیں یا خاکہ نگار کے سامنے شخصیت کا مثبت پہلو ہے تو اس تصویر کو ویسے ہی دکھا دیا جائے یہ مناسب نہیں کہ کسی خامی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر شرط پوری کی جائے۔ محمود علی دوسروں کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں۔ انہوں نے شخصیات کے احسن پہلو دیکھے ہیں لیکن اس کے باجود انہوں نے آرائش جمال مشاطگی نہیں دکھائی۔ انہوں نے جلوے ہی دیکھے ہیں اس لیے ان ہی کا ذکر کیا ہے تاہم بعض خاکوں میں دھیمے اور غیر محسوس انداز میں خامیوں کا ذکر بھی کیا ہے جیسے وہ مولانا عبدالقادر آزاد کے باب میں ان کی مہمان نوازی کی داستان بیان کرتے ہوئے وقت کا ضیاع، عہد فراموشی اور گفتگو کا شوق جیسی خامیوں کا احساس دلاتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر طاہر القادری کے خاکے میں ان کی دنیاداری، کروفر اور شان وشوکت کا تاثر ابھرتا ہے۔ محمود علی اگر کسی پر تنقید کرتے ہیں تو اس میں بھی کاٹ کی بجائے ہلکی سی کسک ہوتی ہے۔

''میں ان دنوں طاہر القادری صاحب کے عروج کا مشاہدہ کر
کے ان کی اور مولانا حامد میاں صاحب (مرحوم) کے مابین
فرق ڈھونڈا کرتا تھا فرق دیوبندی اور بریلوی والا تھا مگر
دونوں اپنے چاہنے والوں کی چاہت سے زینۂ اول پر پہنچے اور
پھر آسمان ہی کی طرف نظر رہی۔'' (ص:۸۴)

''میں نے محسوس کیا مولانا نے گورے ڈپلومیٹ سے ملاقات
میں کوئی پس وپیش نہ کی۔'' (ص:۸۶)

محمد علی کے ہر خاکے کا اختتام ان کے خاص اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے جس میں انفرادی شان پائی جاتی ہے غلام مصطفیٰ جتوئی کے خاکے کے اختتامی جملے ملاحظہ ہوں:

''لیکن اب وہ نہ لیڈر آف اپوزیشن ہیں اور نہ وزیراعظم.....

قومی اسمبلی میں شاید کن انکھیوں سے کبھی لیڈر آف اپوزیشن
بے نظیر بھٹو کو دیکھتے ہیں، کبھی قائدِ ایوان وزیراعظم
محمد نواز شریف کو.....!''

محمود علی کے خاکے چونکہ سیاسی شخصیات سے متعلق ہیں اس لیے ہر شخصیت کے سیاسی سفر کا بیان ضروری ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے بعض لوگ اس پر معترض ہوں وہ خاکہ نگاری کے لیے شخصی معائب ومحاسن تک ہی محدود رہنا چاہتے ہوں لیکن چونکہ سیاسی رویئے سیاسی رہنما کے کردار کا تعین کرتے ہیں اسی لیے پوری سیاسی کہانی کا بیان مناسب بات ہے۔ اس عمل سے یہ فائدہ پہنچا کہ محمود علی کے خاکوں میں بعض نئی باتیں بھی قارئین کے علم میں آئیں جیسے آج شاید ہی کوئی شخص باخبر ہو کہ سابق نگران وزیراعظم ملک معراج خالد بھٹو دور سے بہت پہلے مغربی پاکستان اسمبلی کے پارلیمانی سیکریٹری تھے اور ایک روس نواز عالمی تنظیم ایفروایشن سالیڈیریٹی کی پاکستانی شاخ کے صدر تھے۔ جب وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے تو ان کی معلمہ بیگم بسوں میں سوار ہو کر پڑھانے جاتی تھیں اور وہ اپنی ذاتی گاڑی کو خود چلا کر سکریٹریٹ یا اسمبلی ہال پہنچتے تھے ایک بار گاڑی کی خرابی پر رکشہ میں بیٹھ کر دفتر گئے۔

محمود علی کے خاکوں میں ان کی یہ خواہش بھی ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ ان کے ممدوحین کی صلاحیتوں سے ملک کو فائدہ پہنچایا جائے۔ ان کے خیال میں مولانا شاہ احمد نورانی، حنیف رامے، ڈاکٹر مبشر حسن کی صلاحیتوں سے ملک کو فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیک وقت ان مختلف زاویہ فکر رکھنے والے اشخاص سے ملک کیسے استفادہ کرسکتا ہے۔ اصل بات محمود علی کا جذبۂ حب الوطنی ہے جو باصلاحیت افراد سے ملک وقوم کو فائدہ پہنچانے کا آرزومند ہے۔

محمود علی اگرچہ ادبی دنیا کا غیر معروف نام ہے لیکن اس کی تحریر نہایت پختہ اور ادبی چاشنی رکھتی ہے۔ وہ کہیں بھی تحریر کو بے مزہ اور بوجھل ہونے نہیں دیتے۔ وہ زبان کی نزاکتوں سے کامل طور پر آگاہ ہیں ان کی تحریر کی عمدگی، برجستگی اور حسنِ بیان سے انکار نہیں

kitaabiyat.blogspot.com

کیا جا سکتا۔ مثلاً

''اس پہلی ملاقات کے بعد جو زلزلوں کے جھٹکوں کی طرح شروع ہوئی مگر پرسکون ندی کے ہلکوروں پر ختم ہوئی۔'' (ص:۱۷۴)

سراپا نگاری خاکے کے لیے ایک لازمے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ محمود علی کو اس میں بھی مہارت حاصل ہے وہ آرائشی جملوں کا سہارا لینے کی بجائے سیدھے سادے اور برجستہ جملوں سے شخصیت کا تعارف کراتے ہیں جس سے کسی افسانوی شخصیت کا گمان نہیں ہوتا بلکہ حقیقی تصویر ابھر آتی ہے اور شخصیت نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا قلمی خاکہ یوں کھینچتے ہیں:

''گرم کوٹ، جناح کیپ اور پتلون پہنے وہ چھوٹے قد کے نحیف انسان تھے۔ کلین شیو نہیں تھے مگر سفید داڑھی بس خشخشی ہی تھی۔ چہرہ البتہ دھوپ کی تمازت سے نہیں بلکہ اصلاً سرخ و سپید تھا۔ بیضوی شیشوں والی عینک آنکھوں پر بھلی لگتی تھی۔ شیشوں کے پیچھے برسہا برس کے پیچ و خم دیکھنے والی آنکھیں مولانا کے ٹھنڈے دماغ اور غور و تدبر کرنے والی شخصیت کی غماز تھیں — مولانا ''سرگرمیوں'' والی عمر سے گزر کر زندگی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکے تھے جب جاڑوں میں دھوپ سینکنے اور گرمیوں میں آرام کرسی میں اونگھنے اور پڑھنے لکھنے سے بڑھ کر اور کوئی شغل عزیز نہیں ہوتا۔'' (ص:۷۸)

محمود علی کے خاکوں میں جزئیات نگاری کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی کی پان خوری کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چاندی کی ڈبیہ کا ڈھکن کھلتا ہے۔ گیلے کپڑے میں لپٹے ہوئے پان کی گلوریوں میں سے

ایک باہر آتی ہے، مخملیں پوٹلیوں کا دھاگہ کھینچتا ہے اور اس کا منہ کھلتا ہے اور پان کے لوازمات اس میں سے نکال کر گلوری پر رکھے جاتے ہیں اور آخر میں ایک چھوٹی سی شیشی (عطر کی چھوٹی شیشیوں کی طرح) نمودار ہوتی ہے جس میں سے ایک سلائی رقیق قوام کی بھر کر گلوری پر ٹپکا دی جاتی ہے — اور یوں دستِ مبارک سے مولانا یہ گلوری تیار کر کے منہ میں دبا لیتے ہیں۔'' (ص:۵۰)

اسی طرح بہت سے مقامات پر منظر کشی کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں:

''ریسٹ ہاؤس کے ٹیرس کے ساتھ دریائے سندھ جو طغیانی میں ہو تو Mighty لگتا ہے اس وقت خراماں خراماں بہہ رہا تھا دور شمال کی جانب ریل کے پرانے اور خاصے کمزور پل پر سے کاریں اور ٹرک پل کے گھسے ہوئے ڈھانچے پر سے گھڑ گھڑ کرتے گزر رہی تھیں اور یہ شور رات دن ہر وقت جاری رہتا ہے۔ پل کے دائیں سرے پر ماڑی انڈس کا آخری سٹیشن ہے جہاں براڈ گیج یعنی چوڑی پٹڑی والی ریل گاڑی کا آخری سٹاپ ہے۔ اس سے آگے نیرو گیج کی Narrow guage کی پٹڑی ہے جو پل کے اوپر گزر کر کوئی ڈیڑھ سو میل آگے بنوں تک جاتی ہے مگر یہ تنگ پٹڑی والی ریل گاڑی آج کل چلنا بند ہو گئی ہے کہ وہ پل خاصی خستہ حالت میں ہے۔ خود کالا باغ کے قصبے کا نظارہ دریائے سندھ میں کشتی کی سیر کرتے ہوئے اپنا اصل روپ دکھاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصباتی مکان اور دریا کے کنارے کنارے دور تک لمبائی میں پھیلی ہوئی دکانیں اور

kitaabiyat.blogspot.com

چائے کے سٹال — اپنے پیچھے پہاڑی سلسلے کے ساتھ یوں
جڑے ہوئے ہیں کہ یوں لگتا ہے ان ہی چٹانوں سے باہر نکلے
ہوں — Shangrila غالباً ایسے ہی گاؤں کو کہا جاتا ہے۔''

محمود علی عموماً اپنی بات کی تفہیم کے لیے شعر یا مصرعے سے تحریر کو مزین کرتے ہیں ان کے ہاں کہیں کہیں غیر ضروری انگریزی اور پنجابی الفاظ بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی اتنی بہتات نہیں کہ وہ عبارت کے حسن کو بگاڑیں۔ بعض مقامات پر تو 'ادبدا کر' اور 'نیوڑھے نوڑھائے' جیسے ٹھیٹھ روزمرے استعمال کر کے اپنی تحریر کی شان بڑھاتے ہیں۔

محمود علی کے بہت سے خاکے ایسے ہیں جن میں انہوں نے مذکورہ شخصیت سے صرف ایک دو ملاقاتوں کا احوال لکھا ہے جبکہ ان کی کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اتنی ملاقاتوں میں تو شخصیت کے حوالے سے کافی مواد میسر آجاتا ہے لیکن محمود علی کے مضامین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو وہ مشاہدے کی گہرائی کی صلاحیت سے عاری ہیں یا پھر بہت سی باتوں پر چشم پوشی کی گئی ہے۔ جب وہ کسی شخص کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں: ''کافی مزیدار باتیں ان سے ہوئیں۔'' تو قاری کے ذہن میں ان مزیدار باتوں کو جاننے کی خواہش ابھرتی ہے۔ اسی طرح ان کے بعض خاکے ایسے ہیں جن میں اصل شخصیت سے زیادہ ضمنی شخصیات اور حالات پر گفتگو کی گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان کے پاس مواد نہیں اور مضمون کا پیٹ بھرنے کے لیے یہ عمل اختیار کیا گیا ہے۔ بیگم مہناز رفیع کے حوالے سے لکھا گیا مضمون اس ضمن میں بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ان کے کئی دوسرے شخصی مضامین میں تشنگی کا احساس عروج پر ملتا ہے۔ بیگم صبیحہ شکیل اور شکیل احمد خاں سے مصنف کے قریبی تعلقات تھے لیکن ان کا خاکہ اتنا ہی پھیکا ہے۔ اس خاکے میں دونوں شخصیات کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا جاسکتا تھا لیکن فاضل خاکہ نگار قاری کو بہت زیادہ معلومات فراہم کرنے کی بجائے چند ملاقاتوں کے احوال پر ٹرخا دیتے ہیں۔ مولانا حامد میاں (مرحوم) سے بھی محمود علی کی کئی ملاقاتیں تھیں جن کی روشنی میں ان کی شخصیت کے حوالے سے مزید باتیں سامنے آسکتی تھیں۔ اسی طرح مفتی محمد حسین

نعیمی کے باب میں بھی تشنگی ہے۔ نوابزادہ نصر اللہ خاں کو بہت قریب سے دیکھنے کے باوجود ان کی ذات کے حوالے سے مواد بہت کم ہے۔ صرف سیاسی حالات سے مضمون کا پیٹ بھرا گیا ہے۔ ایس ایم ظفر کے باب میں بھی شخصیت نگاری پر بھرپور توجہ نہیں دی گئی۔

محمود علی امریکی سفارتخانے سے وابستہ تھے وہ اپنی منصبی ذمہ داریوں کے تحت عموماً مصروف ترین سیاستدانوں سے اپنے امریکی افسران کے لیے وقت مانگتے تھے جو انہیں فوراً مل جاتا تھا ادھر یہ بھی خوش ہو جاتے کہ انہیں انکار نہیں کیا گیا یا ان کی بغیر اطلاع آمد پر برا نہیں منایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ امریکیوں کو اپنا آقا و مولیٰ سمجھتے ہیں کسی امریکی سفارتکار سے ملاقات تو ان کے لیے اعزاز کی بات ہے بلکہ اس سے ان کی شان بڑھتی ہے۔ پھر بھلا انہیں ملنے سے کیوں انکار ہو؟ لہٰذا بڑے لوگوں کی مہمان نوازی کو عنایت یا لطف و کرم سمجھنا درست نہیں، بات تو تب ہے کہ ہمارے یہ بڑے ایسا حسن سلوک ایک عام پاکستانی کے ساتھ کریں۔ سیاستدانوں کے یک رخی طرز عمل سے فاضل خاکہ نگار خاصے خوش فہمی و خوش گمانی کا شکار ہیں جس کا اظہار ان کے بہت سے خاکوں میں ملتا ہے۔

محمود علی کی زیر قلم شخصیات چونکہ سیاسی ہیں اس لیے انہیں سیاسی شخصیات کا خاکہ نگار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کے بعض خاکے بھرپور ہیں اور بعض ادھورے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ قلمی چہرہ شناسی میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔

kitaabiyat.blogspot.com